ماہنامہ فاران کراچی

اپریل سنہ ۱۹۶۹ء

شمارہ :- ۱ جلد :- ۲۱

ایڈیٹر :- ماہرالقادری

ترتیب

سالانہ چندہ :- ۷ روپے —— فی پرچہ :- ۶۲ پیسے

پبلشر :- ماہرالقادری

دفتر :- ماہنامہ فاران - کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام مستفیض احمد صدیقی پبلشر ماہرالقادری نے انٹرنیشنل پریس میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اس حقیقت کو بار بار دہرایا گیا ہے اور اسے ہمیشہ دُہرایا جانا چاہیے کہ اسلام ایک مستقل اور دائمی ضابطۂ حیات ہے، اور یہ نظامِ زندگی کے ہر شعبہ کو، جس میں معیشت و اقتصاد بھی شامل ہیں، محیط ہے، اسلام دوسرے مذاہب کی طرح پوجا پاٹ کی رسموں کا نام نہیں ہے اس میں حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق العباد بھی؛ اسلام پوری زندگی کی رہنمائی کرتا ہے، اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسانی زندگی ایسے خانوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے ۔ کہ کچھ خانے تو عبادت کے لئے مخصوص ہیں اور کچھ خانے دین سے خارج ہیں، جن میں آدمی جس طرح چاہے اپنی مرضی اور پسند سے تصرف کر سکتا ہے؛ مسلمان کی پوری زندگی کا تعلق اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے ہے؛ اسلام زندگی کی اس دوئی کو ـــــ کہ قیصر کا حصہ قیصر کو دو اور کلیسا کا کلیسا کو ـــــ باطل قرار دیتا ہے۔

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے، اسلام "آخرت کی بھلائی" کے ساتھ "دنیا کی بھلائی" (ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ) کے لئے دعا کرنے کی تاکید کرتا ہے، دنیا چھوڑنے کے لئے نہیں برتنے کے لئے پیدا کی گئی ہے اور دماغ و جسم کی محنت و ریاضت کے ساتھ کمائی کرنے والے کو اللہ کا دوست (الکاسب حبیب اللہ) کہا گیا ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ ایسے لوگوں کا دُنیا پر غلبہ ہو، جو خدا ترس اور صاحبِ تقویٰ ہوں، جن کا وجود دنیا کے لئے رحمت ہو اور جن کی سیرت تقدیس و پاکیزگی کی ترجمان ہو۔

حکومت دنیا داری کا نہیں دین ہی کا کام ہے بشرطیکہ اُسے اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کے لئے کام میں لایا جائے؛ حکومت "اقامتِ دین" کا موثر ذریعہ ہے، اجتماعی طور پر کتاب و سنت کے احکام کو حکومت ہی نافذ و برپا کر سکتی ہے ـــــ اور وہ اس طرح کہ "امر بالمعروف" جاری کیا جائے اور "نہی عن المنکر" پر قانونی پابندی لگائی جائے؛

اسلام میں ہر مسلمان پر "فرد" کی حیثیت سے یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تقویٰ اور نیکوکاری کی زندگی گزارے، اُس مسلمان کی قیامت کے دن سخت پکڑ ہوگی جو خود تو اسلامی احکام پر عمل نہیں کرتا مگر دوسروں کو بھلائی کے لئے نصیحت کرتا ہے یا تقویٰ اور صفائی کا موں میں لگا رہتا ہے، اسی طرح اُس مسلمان کو بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہی کرنی پڑے گی جو خود تو ارکانِ اسلام کا پابند ہے اور اس کی زندگی میں تقویٰ پایا جاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے احکام کو عملاً نافذ کرنے کے لئے کوئی کام نہیں کرتا، دنیا میں کچھ بھی ہوتا رہے، دین غالب رہے یا مغلوب، کتاب و سنت کے احکام معطل رہیں یا نافذ ہوں، معاشرہ بگڑے یا بنے، اس سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتا، اُسے بس اپنی ہی نجات و مغفرت کی فکر ہے؛

اسلام میں انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی ذمہ داریاں ہیں، اور ان دونوں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی ایک مسلمان

کہ اپنی استطاعت کی حد تک جدوجہد کرنی چاہئے ۔ اپنی ذات کی حد تک اسلامی احکام کی تعمیل اور پرہیزگاری و تقوٰی کی زندگی بسر کرنے کے لئے کسی ماحول اور حالات کی قید نہیں ہے ، اس قسم کی صالح انفرادی زندگی ہر ماحول میں گزاری جا سکتی ہے ! وہ امریکہ ہو ، فرانس ہو ، چین ہو یا روس ، کسی ملک اور سلطنت میں بھی کسی فرد کو قانون کے زور سے شراب پینے ، زنا کرنے ، ناچنے گانے ، جوا کھیلنے اور اس قسم کے دوسرے گناہوں پر مجبور نہیں کیا جاتا ، اشتراکی ملکوں میں مسجدوں میں نماز پڑھنے کی پوری آزادی نہیں ہے ، وہاں ایک مسلمان اپنے گھر میں نماز ادا کر سکتا ہے ، روزہ پر کہیں کوئی پابندی نہیں ۔ فریضۂ حج ادا کرنے پر بعض ملکوں میں بھی قانونی پابندیاں ہیں ۔ اگر ایک مسلمان ان قدغنوں اور پابندیوں کے سبب اپنی امکانی کوشش و تمنا کے باوجود فریضۂ حج ادا کرنے سے محروم ہے تو اس محرومی پر اس سے قیامت کے دن باز پرس نہیں کی جائے گی ، اس لئے کہ وہ خود تو اڑ کر وہاں نہیں پہونچ سکتا ، اس مقدس سفر کے ذرائع میں اُن پر اسے قابو حاصل نہیں ہے ۔ اس صورت میں فریضۂ حج کے ادا نہ کرنے کا الزام اس پر نہیں آ سکتا کہ وہ "مضطر" ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم بے پایاں سے اضطرار کی حالت میں رخصت اور چھوٹ عنایت فرما دی ہے !

ابھی تک تو ایسا ہی سننے میں آیا ہے کہ دنیا کے کسی ملک اور خطہ میں جھوٹ بولنے ، رشوت لینے ، غیبت کرنے ، کم تولنے ، نامحرم عورتوں کو بُری نگاہ سے دیکھنے ، چوری کرنے ، ڈاکہ ڈالنے ، لوگوں کا بُرا چاہنے ، اپنے کو بڑا سمجھنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا ، ان برائیوں سے خاص کافرانہ ماحول میں بھی ایک مسلمان بچ سکتا ہے ، جہاں فتنوں کا ہجوم ہو اور نفس کے لئے سہل الحصول لذتیں موجود ہوں ، وہاں برائیوں سے بچنے میں اور زیادہ ثواب ملے گا ۔

اب رہا اجتماعی زندگی ―――― کا مسئلہ تو اس فریضہ کے ادا کرنے کی ہر جگہ ایک ہی جیسی صورت نہیں ہے جس ملک میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے وہاں ایک مسلمان کو اس جدوجہد میں جس کا موضوع و مقصد اقامت دین ―――― ہونا چاہئے ، جو کوئی صرف اپنی انفرادی پاکبازی اور شخصی دینی زندگی پر قانع رہ کر اس جدوجہد میں شریک نہ ہوگا اُسے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کوتاہی کی جوابدہی کرنی پڑے گی ؛ معاشرے کی اصلاح کی فکر بھی ضروری ہے ، ملک ، شہر ، بستی ، محلہ ، پاس پڑوس اور پھر خود اپنے گھر کی اصلاح کی کوشش کرنی ضروری ہے ، کتنے بہت سے ماں باپ ہیں جو خود تو نیک اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں مگر اپنی اولاد کو نیک بنانے کی فکر نہیں کرتے ، اس فریضہ سے غافل ہیں ، اُن پر اپنا وقت صرف کرنے کی زحمت سے بچ جاتے ہیں ، قیامت کے دن حاکموں اور فرمانرواؤں ہی سے نہیں ، گھر کے سربراہوں (رعایوں) سے بھی گھر والوں (رعایا) کے بارے میں ―――― پوچھ گچھ ہوگی کہ تم نے اُن کی دُنیوی ضروریات پوری کرنے کے لئے تو سب کچھ کیا مگر اُن کی دینی اور اخلاقی زندگی سے غفلت برتی ! جو فریضہ سب سے زیادہ توجہ دینے کا مستحق تھا اسی سے تم غافل رہے !

کسی مسلمان گھرانے کا کوئی نوجوان اسکول یا یونیورسٹی کے امتحان میں ناکام ہو جاتے تو گھر میں سوگ منایا جاتا ہے ، سارا گھرانا غم میں ڈوبا ہوا اور چہرے گرد ملال سے دھندلائے ہوئے ! مگر وہی نوجوان نماز سے غفلت برتتا ہے روزے نہیں رکھتا اس پر کسی کو ملال نہیں ہوتا اور اس طرز پر بہت ہی کم سوچا جاتا ہے کہ فرائض کے ترک پر اس نوجوان سے اللہ تعالیٰ کے یہاں جوابدہی ہوگی اور اپنے گناہوں کے سبب اُسے عذاب دیا جائے گا ۔ اس دنیا میں تو اپنی اولاد کے آرام ، عیش و آسودگی کے لئے مسلمان ہر طرح کے جتن کرتے ہیں مگر اولاد کو جہنم کی آگ سے بچانے کا شاذ و نادر ہی کسی کو خیال آتا ہے ۔

ضعف عمل ہو یا ضعف ایمان اس کا سب سے بڑا سبب ہے آخرت سے غفلت یا آخرت فراموشی ، ہم سب آخرت پر ایمان رکھتے ہیں مگر یہ ایمان اقرار باللسان تک محدود ہے ، دلوں میں اُترا ہوا نہیں ہے ! اگر کسی شخص پر عدالت میں مقدمہ قائم ہو جاتے ، تو جس طرح

اُس ملزم کے دل و نگاہ میں ہر وقت عدالت بسی رہتی ہے اور پیشی کا خیال اُس پر چھایا رہتا ہے، جلوت ہو کہ خلوت ہر حال میں مقدمہ کی ملزم کو فکر رہتی ہے، الزام سے بری ہونے کے لئے ملزم زمین آسمان ایک کر دیتا ہے، ـــــ آخرت کی فکر کم سے کم اس درجہ کی تو ہونی چاہئے، موت کی یاد اور آخرت کی فکر جتنی زیادہ ہوگی، آدمی دین کے بارے میں مخلص ہوگا اور اس اخلاص کا مسلسل اظہار اُس کی زندگی سے ہونا چاہئے! دنیا کی خواہشیں اور تمنائیں محدود، نام و نمود اور شہرت سے بے پروائی، دنیا میں بڑا بننے اور لوگوں کے منہ سے تعریفیں سننے سے گریز، ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی فکر، اسی کا خیال کہ یہ دنیا تو تنگی ترشی کے ساتھ گزر ہی جائے گی اصل فکر آخرت کی ہونی چاہئے جہاں ہمیشہ رہنا ہے! دنیا کی آگ کی گرمی کے ساتھ جہنم کی آگ کا تصور، جس کی شدت کی کوئی حد و انتہا نہیں، اس تصور سے دل میں خشیت الٰہی پیدا ہوگی! بیم کے ساتھ رجا بھی! مسلمان چاہے ایسا ہی گنہگار کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوا کرتا، مایوسی اور ناامیدی تو کفر کا خاصہ ہے! ایک مسلمان کے قلب کی حالت بیم و رجا کے درمیان رہنی چاہئے اس کا خوف کہ اللہ تعالیٰ شدید العقاب ہے اس کی پکڑ سے کوئی بچ نہیں سکتا، اس کا غضب کوئی مفروضہ نہیں ایک حقیقت ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید کیونکہ وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی ہے!! اپنے بڑے سے بڑے نیک عمل کو حقیر ہی سمجھنا چاہئے، ہر وقت اپنی کوتاہی اور غفلت کا احساس: یہ کہ ہم سے کسی ایک فریضہ کا بھی ٹھیک طور پر حق ادا نہیں ہو سکا، اللہ تعالیٰ کے حضور تذلل و عاجزی اور خضوع و خشوع اور اخبات و فروتنی کا زیادہ سے زیادہ اظہار!! اللہ تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ بندوں کے حقوق ادا کرنے کی فکر! حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، جس نے حقوق اللہ ادا کئے مگر حقوق العباد سے بے پروائی برتی اُسے اس بے پروائی اور غفلت کی اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کرنی پڑے گی اور جس نے حقوق العباد کا تو بہت کچھ خیال رکھا، مگر حقوق اللہ سے غافل رہا وہ بھی قیامت کے دن مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوگا۔

اسلام میں بے شک رہبانیت نہیں ہے مگر رہبانیت نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی دنیا کی خواہشوں ہی میں الجھ کر رہ جائے، جائز لذتوں کی بھی کچھ حدود ہیں، دنیا کی خواہشوں اور لذتوں کی کثرت و فراوانی کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نفس "رخصتوں" کا خوگر ہو جاتا ہے، اور رخصتوں کا حال چراگاہ کی آخری حدود جیسا ہے جو جانور چراگاہ کے اندرونی رقبہ کو چھوڑ کر چراگاہ کی سرحد ہی پر چرتا رہتا ہے، وہ بالآخر چراگاہ کی حدود کو توڑ دیتا ہے۔

اپنی ذات پر "دین کو قائم کرنا" اپنے متعلقین کو دین سے قریب لانا اور پھر معاشرے میں اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم و برپا کرنا اسی کا نام "اقامت دین" ہے، جو کوئی اپنی ذات پر ہی دین کو قائم کر کے رُک گیا وہ "اقامت دین" کا فریضہ کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں ہوا، قیامت کے دن اس کوتاہی پر اُس سے بازپُرس ہوگی، اپنی ذات، متعلقین اور معاشرہ ان سب پر "اقامت دین" کے لئے جدوجہد یہ ہے اس فریضہ کا حقیقی تقاضا! اور اس فریضہ کے ساتھ وہ مخلصانہ سلوک جو اہل ایمان کی خصوصیت ہے۔

"اقامتِ دین" کی اصطلاح وسیع مفہوم کی حامل ہے، صدقِ دل کے ساتھ کسی کو قرآن پاک کی ایک آیت سکھا دینا اور کسی نومسلم کو کلمہ طیبہ یاد کرا دینا بھی "اقامتِ دین" ہی کا کام ہے، جو لوگ ـــــ دین کے کسی ایک جز، ایک رکن یا ایک فریضہ کو "کل دین" سمجھ کر بس اُسی میں لگے رہتے ہیں، وہ "اقامتِ دین" کی جامعیت کا حق ادا نہیں کرتے، اس کوتاہی میں نفس کی سہل پسندی بھی شامل ہوتی ہے۔

عوام ہوں یا خواص مسلمان کو ہر حال میں حق بات ہی کہنی چاہئے حق گوئی مردِ مومن کی بہت بڑی صفت ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عوام میں ہر دلعزیز ہونے کے خوف سے آدمی حق بات کہنے سے گریز کرتا ہے، تھرِ والیاں ہوں یا جھونپڑیاں ہر جگہ اظہار حق ہی کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کا خوف نہیں، خشیت الٰہی بہت بڑی نعمت ہے، ہم سب اس مرض کے مریض ہیں کہ دلوں سے خوف خدا جاتا رہا ہے۔ خدا خوفی دراصل تقویٰ اور نیکوکاری کی بنیاد ہے، مسلمانوں کے معاشرے کی اساس تقویٰ ہی ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے عزت و تکریم کا معیار "تقویٰ" مقرر

کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بات ہی سب سے زیادہ سچی، محکم اور یونیورسل ہوتی ہے۔

اظہارِ حق بہرحال مردِ مومن کے فرائض میں داخل ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

"اقامتِ دین" کا کوئی ایسا لگا بندھا قانون نہیں ہے، جو ہر جگہ یکساں طور پر برتا جاتا ہے، ماحول اور حالات کا اس پر خاصہ دخل ہوتا ہے وہ شخص پرلے درجہ کا سادہ لوح ہوگا جو فرانس، انگلستان، کینیڈا، امریکہ اور روس وچین میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کا نعرہ لگائے اور اپنی ساری توانائیاں اسی جدوجہد میں صرف کردے، ان ملکوں میں اسلام کا صحیح تعارف، ایسا تعارف جس سے اسلام کے بارے میں مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں دور ہوسکیں، "اقامتِ دین" ہی کا ہاں! اُن ملکوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں طریق کار دوسرا ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے پورے پورے دین کا غلبہ!

قرآن پاک میں جسے "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" فرمایا گیا ہے، اس کو عملی طور پر معاشرے میں حکومت ہی نافذ کرسکتی ہے! لئے جس ملک میں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں کی سوسائٹی میں نیکی، سچائی اور خیر و تقویٰ کا چلن ہونا ضروری ہے، بھلائیوں پھیلایا جائے اور برائیوں کو مٹایا جائے! قرآن پاک میں نیکیوں کو اسی لئے "معروف" کہا گیا ہے کہ اُسے سب جانتے ہیں" اور "نہی عن المنکر" کے ذریعہ معاشرہ کو خیر و فلاح میسّر آسکتی ہے۔

مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خود نیک بنے اور نیکی کو پھیلائے دوسروں کو نیک بننے کی نصیحت کرے چراغ سے چراغ جلتا ہے یہی دنیا کی ریت ہے! عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے مقدس دور میں نیکی سبزے کی طرح اُگتی اور اللہ کی رحمت شبنم کی طرح برستی تھی اُس کا یہ سبب تھا کہ اُس دور کے عوام و خواص کے دلوں میں خوفِ خدا پایا جاتا تھا۔ اور وہ نفوسِ قدسیہ آخرت کی جوابدہی کا زیادہ سے زیادہ احساس رکھتے تھے، ہم اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرتے ہیں۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

مگر

ہم اپنے اعمال کو نہیں دیکھتے ——— اکبر الٰہ آبادی نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔

جب میں کہتا ہوں اے اللہ! میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

جمہوریت اور آزادی کی افادیت اپنی جگہ مسلّم مگر جب اس کا استعمال فتنہ و فساد اور ماردھاڑ کے لئے ہونے لگے تو یہ
ت، زحمت سے بدل جاتی ہے ایسے موقع پر اسلام پسند اور امن دوست لوگوں کا فرض ہے کہ وہ معاشرے کو فتنہ و فساد
ہائیں، عوام کو شائستگی اور تہذیب و انسانیت کا درس دیں خاص طور سے نوجوانوں کو اخلاقی حدود میں رکھنے کی کوشش کریں!
...انوں کے گرم و جوان جذبات قابلِ قدر ہیں مگر ان جذبات کا رُخ تعمیر و شائستگی کی طرف پھیر دینے کی ضرورت ہے!

ہمیں آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ اقامتِ دین کی ذمہ داری پوری ملت پر عائد ہوتی ہے، ہر ملک، خطہ اور شہر کے حالات اور
...نوں کا خیال رکھتے ہوئے اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کی جدوجہد کرنی چاہیے! نتائج کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے اس کا تعلق
...تعالیٰ کی حکمت اور مشیت سے ہے، ہماری ذمہ داری ——— جدوجہد ——— ہے یہاں تک کہ اللہ کے دین
...الب اور عملاً قائم کرنے کی جدوجہد میں ہماری زندگی ختم ہو جائے اور قبر سے لے کر روزِ جزا تک ہر مرحلہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و
...ت ہمارے حصہ میں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے ہم مستحق قرار پائیں۔

حالات سازگار ہوں یا ناسازگار، ہمیں ہر حالت میں اللہ تعالیٰ ... کے لئے جدوجہد کرنی ہے، اس اخلاص و
...ی کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہم کسی اور سے اپنی اس خدمت کا اجر نہیں چاہتے۔ نعم المولیٰ ونعم النصیر!

[illegible]
۳۰ مارچ ۹۰ء

طیب شاہین لودھی

بعض لوگوں کو حیرت ہے کہ محدثین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے حدیث کے اتنے بڑے ذخیرے کو کیسے یاد رکھا۔ ہمارے لئے تو بے شک یہ حیرت و استعجاب ہی کا مقام ہے۔ مگر یہ لوگ سلف محدثین کے حافظہ کو بیسویں صدی کے لوگوں کے حافظہ پر قیاس کر کے سنتِ نبوی پر شک و شبہات کی دھول اڑانی شروع کر دیتے ہیں۔ اگر یہ ذرا سی عقل و فہم سے کام لیں اور اپنی آنکھوں سے تجدد کی عینک اتار کر دیکھیں تو یہ بات نہایت آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ آج سے تقریباً ۱۳، ۱۴ سو سال پیشتر لوگوں کی یادداشت کا دارومدار صرف حافظہ پر تھا اس لئے ان کا حافظہ قوی ہوا کرتا تھا۔

علم الابدان کے ماہرین کی رائے ہے اور عام مشاہدہ بھی یہی گواہی دیتا ہے کہ جسم کے اعضاء سے جتنا کام لیا جائے گا ان کی کارکردگی میں اسی قدر اضافہ ہوگا اور ان کو بے کار چھوڑ دیا جائے تو ان کی کارکردگی کی اصل حیثیت باقی نہیں رہ سکتی۔ زمانہ قدیم میں انسان جب زندہ رہنے کی جدوجہد میں پُرمشقت زندگی بسر کرتا تھا تو وہ مضبوط اعضاء کا مالک تھا۔ قوتِ حافظہ بھی اسی اصول کے تحت کم یا زیادہ ہوتی ہے، ڈارون کے نظریۂ ارتقاء سے بھی، جس پر یہ مغرب زدہ گروہ وحی کی طرح ایمان رکھتا ہے اس کی تائید ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور اس سے پہلے کتابت وغیرہ کا رواج بہت کم تھا۔ تمام عرب میں پڑھے لکھے لوگ بہ مشکل کہیں ڈھونڈنے سے ملتے تھے۔ لوگوں کا لین دین اور کاروبار اور عام یادداشت حافظہ کی مدد سے چلتے تھے۔ عرب کی تاریخ سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے کی معاشرتی زندگی میں شعر و شاعری کو کس قدر دخل حاصل تھا۔ ہر قبیلے کے اپنے اپنے شاعر ہوا کرتے تھے ہر شخص شعر کا دلدادہ تھا۔ ان لوگوں کو قصیدے اور اشعار زبانی یاد ہوتے تھے۔ ہمارے پاس جاہلیت کے عربی اشعار کا جو ذخیرہ موجود ہے زبانی روایت کے ذریعہ ہی سے تو ہم تک پہنچا ہے۔ عربوں کے نسب پر طعن تو ان کے لئے موت اور زندگی کا سوال بن جایا کرتا تھا۔ اس لئے انہیں پشت ہا پشت تک کا شجرہ نسب یاد ہوا کرتا تھا۔ ان کی یہ عادت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنے اونٹ اور گھوڑوں تک کے شجرے یاد رکھتے تھے۔ کتابت کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب کچھ انہیں حفظ کرنا پڑتا تھا اور حفظ و ضبط کا یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ جاری رہتا۔

حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جاہلی معاشرہ کو خاص طور پر اسلام کے لئے تیار کیا تھا۔ اہلِ عرب کے حافظے کی اس فطری خوبی نے قرآن و سنت کی اشاعت میں خوب کام دیا۔ جب قرآن نازل ہوتا تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینوں میں محفوظ ہو جاتا تھا —

ں زمانے میں قرآن کریم کی سولیصد اشاعت حافظے کی مدد سے ہوئی ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل میں قاری حضرات کو بلیغ یا تعلیم قرآن کی غرض سے بھیجا تھا ۔ تو ان کو حضورؐ نے قرآن کے نسخے لکھوا کر نہیں دیئے تھے ۔ اور نہ ان قبائل کے نو مسلم لوگوں نے یہ مطالبہ یا تھا کہ "ہمیں تو قرآن اور اللہ کے رسولؐ کے احکام تحریری شکل میں دکھاؤ تب ہم یقین کریں گے کہ یہ وہی قرآن ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے ۔ خدا جانے زبانی تمہیں یاد رہا ہے یا نہیں ؟" قرآن کے بارے میں ایسا کوئی سوال ان کے درمیان پیدا نہیں ہوا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود قرآن کریم حفظ کرنے کی بے حد ترغیب دیا کرتے تھے ۔ جس کی وجہ سے اکثر صحابہ کرام کو قرآن کریم د تھا ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔

من تعلم القرآن فاستظهره حفظه	جس نے قرآن سیکھا اسے زبانی پڑھا اور اس کو حفظ
ادخله الله الجنة (مسند الامام احمد جلد ۱ ص۱۴۹)	کیا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا ۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ۔

ان الرجل الذی لیس فی جوفه شیئ	وہ شخص جس کے سینے میں قرآن کا کوئی حصہ بھی نہیں
من القرآن کالبیت الخرب	اجڑے ہوئے گھر کی مانند ہے ۔

(مسند الامام احمد بتحقیق احمد محمد شاکر جلد ۳ ص)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب اور شوق دلانے کا یہ اثر تھا کہ بہت سے صحابہ کو قرآن یاد تھا آپ قرآن یاد کرنے کی اس قدر ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ آپ نے ایک مسلمان عورت کو ایک مسلمان مرد کے نکاح میں دیتے ہوئے مہر یہ مقرر کیا کہ وہ و صحابی اپنی بیوی کو مہر کے بدلے میں قرآن کا وہ تمام حصہ یاد کرا دے جو اسے یاد ہے (ملاحظہ ہو موطا امام مالک جلد ۲ ص۹۳)

ایک دوسرا واقعہ ہے ۔ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں "آپ نے ایک بار ایک جماعت روانہ کی (جب امیر بنانے کا سوال سامنے یا تو) آپ نے ان میں سے ہر ایک سے قرآن سنا آپ ایک شخص کے پاس آئے جو ان میں سے سب سے کم عمر تھا ۔ آپ نے فرمایا اے فلاں تمہیں رآن کا کون سا حصہ یاد ہے اس نے عرض کیا قرآن کا فلاں فلاں حصہ اور سورۃ البقرہ آپ نے فرمایا اچھا تمہیں سورۃ البقرہ یاد ہے؟ ں نے عرض کیا ہاں " آپ نے فرمایا " جاؤ تم ان کے امیر ہو" (الماثورات ۔ امام حسن البنا شہید ص۴۲)

حضرت عمرو بن سلمہ روایت کرتے ہیں کہ ہمارا قبیلہ ایک چشمہ کے کنارے آباد تھا ۔ آتے جاتے اس چشمے پر ٹھیرتے ۔ قبیلہ کے ان وگوں سے دریافت کرتے کہ اس شخص کا کیا حال ہے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا) تو وہ کہتے کہ اس شخص کا دعویٰ ہے کہ میری طرف ی بھیجی جاتی ہے ۔ عمرو بن سلمہ کہتے ہیں کہ میں ان سے سن کر قرآن یاد کرلیا کرتا تھا ۔ فتح مکہ کے بعد جب ہمارا قبیلہ مسلمان ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے احکام بتائے اور کہا کہ تم میں سے سب سے زیادہ قرآن جاننے والا تمہاری امامت کرے ، تو بیلہ والوں کو مجھ سے زیادہ قرآن جاننے والا کوئی نہ ملا حضرت عمرو بن سلمہ اس وقت بچے ہی تھے ۔ (ملخصاً مشکوٰۃ المصابیح باب الامامۃ ص۹۲)

م ہشام بنت حارثہ کہتی ہیں کہ میں نے سورۃ "ق" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بلا واسطہ یاد کی ہے ۔ آپ اکثر عہ کے خطبہ کے دوران منبر پہ پڑھا کرتے تھے ۔ (نیل الاوطار جلد ۳ ص۳۰۳)

فرافصہ بن عمیر کہتے ہیں کہ میں نے سورۃ یوسف نہیں یاد کی مگر حضرت عثمانؓ کی قرأت سن کر کیونکہ وہ عام طور پہ صبح کی نماز میں پڑھا رتے تھے (موطا امام مالک مع تنویر الحوالک جلد ۱ ص۱۰۳)

حفظ قرآن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب کا یہ نتیجہ نکلا کہ بے شمار صحابہ کرام کو پورا قرآن حفظ تھا کوئی مسلمان

ایسا نہ تھا جسے قرآن کا کوئی نہ کوئی حصہ یاد نہ ہو۔ بئر معونہ کے واقعہ میں تقریباً ستر صحابہ شہید ہوئے۔ (فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۴۵) ان سب کو قرآن کا اکثر حصہ یاد تھا۔ یہ سب قرأ بیئر معونہ کے نام سے مشہور ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے جنگ یمامہ میں سات سو سے زیادہ صحابہ شہید ہوئے۔ علامہ ابن حجر فتح الباری میں جمع قرآن والی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ھذا یدل ان کثیرا ممن قتل فی وقعة الیمامة کان حفظ القرآن .... (ملاحظہ ہو فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۹)

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جنگ یمامہ میں شہید ہونے والوں کی اکثریت ایسی تھی جنہوں نے قرآن حفظ کیا تھا۔

اس واقعہ نے دوراندیش صحابہ کرام کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد ہی حضرت عمرؓ کے مشورہ سے جمع قرآن کا کام شروع ہوا تھا۔ جس میں حفاظ سے بھی اتنی مدد لی گئی تھی۔ جتنی لکھے ہوئے اوراق وغیرہ سے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اگرچہ قرآن کو ایک جگہ محفوظ تو کر لیا گیا تھا۔ مگر قرآن کی اشاعت حافظے کی مدد ہی سے ہوتی تھی۔ اکثر اجل صحابہ کے نام ملتے ہیں، جنہیں قرآن حفظ تھا۔ مثلاً عبداللہ بن مسعود، ابوایوب انصاری، عبادہ بن صامت، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، ابوزید خزرجی، سالم مولی ابی حذیفہ، ابوالدرداء، مجمع بن جاریہ، علی بن ابی طالب، عثمان بن عفان اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ ان حضرات سے تابعین نے قرآن حفظ کیا۔ اس زمانے سے آج تک ہر دور میں حفاظ قرآن کا ایک جم غفیر موجود رہا ہے (اور انشاءاللہ رہے گا) کیونکہ حفظ قرآن بقول علامہ سیوطی۔ امت پر فرض کفایہ ہے۔ (الاتقان جزء ۱ صفحہ ۹۹) آج بھی اس گئے گذرے زمانے میں شاید ہی کوئی بدقسمت مسلمان ہو جسے قرآن کا کچھ حصہ بھی یاد نہ ہو۔ آج اگر خدانخواستہ قرآن کریم کے تمام نسخوں کو دنیا سے غائب کر دیا جائے تب بھی قرآن کا ایک حرف بھی ضائع نہ ہو سکے گا۔

بل ھو اٰیٰت بینٰت فی صدور الذین اوتوا العلم (قرآن مجید)

مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد یہ ہے قرآن کریم کی حفاظت اس کی کتابت پر موقوف نہیں ہے اور نہ حافظے سے نقل کی ہوئی چیز رد کر دینے کے قابل ہے۔

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو قرآن سکھاتے تھے اور حفظ کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ اسی طرح سنن بھی سکھایا کرتے تھے۔ نماز، روزہ، زکوۃ، حج معاملات یعنی کون سا ایسا کام تھا جس میں حضورؐ نے واضح ہدایات نہ دی ہوں پھر حضور اتنے زیادہ شفیق تھے کہ بقول امام نووی ایک ایک بات تین تین بار دہرایا کرتے تھے۔ تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے (نیل الاوطار جزء ۳ صفحہ ۱۳۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو ترغیب دیا کرتے تھے کہ وہ آپ کی باتوں کو یاد رکھیں اور آنے والی نسلوں کو پہونچائیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلمنا التشھد کما یعلمنا القرآن۔
(مسند الامام احمد جلد ۱ صفحہ ۲۹۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس طرح تشہد سکھایا کرتے تھے۔ جیسے آپ قرآن سکھاتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس ہی روایت کرتے ہیں۔

ان رسول اللّٰہ صلی اللہ کان لیعلمھم ھذا الدعا کما یعلمھم السورۃ من القرآن یقول اللھم انی اعوذ بك من عذاب جھنم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو یہ دعا اس طرح سکھایا کرتے تھے جس طرح قرآن کی کوئی سورۃ سکھاتے تھے۔ فرماتے اللھم انی اعوذ بك من عذاب جھنم .....
(موطا امام مالک جز ۱ صفحہ ۲۱۶)	

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام کا بھی یہی دستور رہا ہے کہ تابعین کو سنن یاد کرایا کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عبد قاری روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو سنا وہ منبر پہ بیٹھے لوگوں کو تشہد سکھا رہے تھے۔

(موطا امام مالک جز ۱ صفحہ ۱۱۴)

حضرت عکرمہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دیا کرتے تھے۔ اور مجھے قرآن اور سنن سکھایا کرتے تھے۔

(سنن الدارمی جلد ۱ صفحہ ۱۱۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی یہ تمام ترغیب و تاکید اسی لئے تو تھی کہ سنت محفوظ رہے اور ان کے بعد آنے والی نسلوں تک پہونچ سکے ورنہ صحابہ کرام کو "مرکز ملت" کے ہوتے ہوئے اتنی محنت کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ یہ بھی جانتے ہوں کہ ہر زمانے میں ایک نہ ایک "مرکز ملت" تو ضرور موجود رہے گا۔ اس کی قرآنی تشریح و تعبیر کے ہوتے ہوئے نبیؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قولی و فعلی ہدایات غیر ضروری ہوں گی اس قسم کا وہم تک صحابہ کرام کے ذہن و قلب میں پیدا نہیں ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے قرآن کی تشریح و توضیح کی اور ترغیب و تاکید سے صحابہ کرام کو یہ بتا دیا کہ قرآن کے ساتھ ساتھ میری تشریح کو یاد کرو، نہیں اسے آنے والی نسلوں کو پہنچانا ہے تاکہ علم دین محفوظ رہ سکے۔

حج وداع پہ جبکہ تقریباً تمام مسلمان حج کے لئے اُمڈ پڑے تھے۔ آپ نے اپنے تاریخی خطبہ میں فرمایا۔

نضّر اللّٰہ امرأً سمع منا حدیثا فحفظہ حتی یبلغہ۔	تازہ رکھے اللہ تعالیٰ اس شخص کو جس نے ہم سے حدیث سنی پھر اسے یاد رکھا حتیٰ کہ آگے پہونچا دی۔

(عن ابن مسعود مسند احمد جلد ۱ صفحہ ۹۶)

تقریباً انہی الفاظ میں یہ حدیث مشکوٰۃ میں بیہقی۔ شافعی۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ دارمی وغیرہ کے حوالے سے حضرت زید بن ثابت اور ابوالدرداءؓ سے روایت ہوئی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری نے بھی اسے ان الفاظ میں روایت کیا ہے نضر اللّٰہ امرأً سمع مقالتی فوعاھا۔ اللہ تعالیٰ سرسبز رکھے ایسے شخص کو جو میری بات کو سنے اور پھر سے یاد رکھے۔ فرمایا۔

الا فلیبلغ الشاھد الغائب	خبردار (میری بات) حاضر غائب کو پہونچا دے

(عن ابن عباسؓ مسند الامام احمد جلد ۳ صفحہ ۲۲۴ سنن دارمی عن ابی بکرۃ جلد ۱ صفحہ ۲۹۴)

پھر اسی پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ یہاں تک فرمایا۔

فربّ مبلغ احفظ لہ من سامع — اکثر، سننے والے سے وہ زیادہ حافظ ہوتا ہے جس کو پہونچایا جاتا ہے۔

صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں یاد کیسے نہ رہتیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسوۂ حسنہ کو انسانیت کے یہ معیار اور نمونہ بنایا تھا اور سرکار کی اطاعت کو اپنی (اللہ تعالیٰ کی) اطاعت کی طرح منصوص ٹھیرایا۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر صحابہ کا یہ حال ہوتا تھا کہ کھانے پینے کی پرواکئے بغیر ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا کرتے تھے، اصحاب صفہ (رضی اللہ عنہم) کی مشہور جماعت جو ہر وقت مسجد میں رہتی تھی ان حضرات کا تو کام یہی تھا کہ حضور سے علم سیکھیں اور اسے یاد رکھیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا شمار اصحاب صفہ میں ہی ہوتا ہے۔ "مہاجرین جب بازار میں اپنے کاروبار میں مشغول ہو جاتے اور انصار اپنے اموال و مویشی میں۔ تو میں اس وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگا رہتا اور آپ سے علم سیکھتا رہتا۔ (مسند احمد جلد ۱۲ ص۲٦۵)

اور اس بات کا اعتراف ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر رض نے بھی حضرت ابوہریرہ رض کے سامنے کیا ہے۔

انت یا اباهريرة كنت الزمنا لرسول الله صلى الله عليه وسلم واعلمنا بحديثه (مسند احمد جلد ٦ ص۲۱)

(واقعی) اے ابوہریرہ آپ ہم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے ہیں اور حضورؐ کی حدیث کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

پھر صحابہ کرام کی یہ عادت تھی کہ وہ علم کو چھپایا نہ کرتے تھے۔ اور کتمانِ علم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وعید کا انہیں علم تھا۔ حضورؐ کے یہ الفاظ یاد کر کے کانپ جایا کرتے تھے۔ من سئل عن علم فکتمہ الجم بلجام من نار یوم القیامۃ جس کسی سے علم کی بات پوچھی گئی اور اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے روز اسے آگ کی لگام دی جائے گی۔ ایک طرف کتمان علم پر اتنی بڑی وعید تھی دوسری طرف صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو بھی خوب جانتے تھے۔ جس کی حضورؐ بار بار یاد دہانی کراتے رہتے تھے۔ من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے تو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے (نقل بالتواتر) کبھی حضورؐ فرماتے "من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین" (بروایت سمرہ بن جندب و مغیرہ بن شعبہ مشکوٰۃ) جو کوئی مجھ سے حدیث روایت کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ حدیث جھوٹی ہے۔ تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

یہی وجہ ہے حضرت ابوہریرہ حدیث سنانے سے پہلے حضورؐ کا ارشاد من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار پڑھ لیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تو یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ایک لفظ بھی کم یا زیادہ نہیں کرتے تھے۔ (سنن الدارمی جزو ۱ ص۹٤)

حضرت عبداللہ بن مسعود کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہتے ہوئے آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا پھر فرماتے حضورؐ نے ایسے فرمایا ہے یا اس کے لگ بھگ (مسند الامام احمد جلد ۵ ص۲۵٤)

شرحبیل ابو سعد کہتے ہیں کہ حضرت حسن رض نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو بلایا اور کہا۔

یا بنی و بنی اخی انکم صغار قوم یوشک ان تکونوا کبار آخرین فتعلموا العلم فمن لم یستطع منکم ان یرویه او قال یحفظ فلیکتبه ولیضعه فی بیته -

(دارمی جزء ۱ صـ۱۳۰)

اے میرے بیٹو اور بھتیجو اب تو تم چھوٹے ہو عنقریب تم آنے والی نسل کے بزرگ ہوگے پس علم سیکھو۔ جو روایت کرنے پر قادر نہ ہو یا فرمایا حفظ کرنے پر قادر نہ ہو تو وہ اپنے پاس لکھ رکھے۔

اُن حضرات کو حدیث نبوی گھر بیٹھے بٹھائے آسانی سے نہیں مل جایا کرتی تھی کہ وہ آسانی سے اسے بھول جائیں - وہ حدیث لینے کے لئے سینکڑوں میل کے سفر کی صعوبتیں برداشت کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ ہم بصرہ میں روایت سُنتے تو اُس پر اکتفاء نہ کرتے تھے اور اس وقت تک چین نہ لیتے تھے جب تک ہم مدینہ جاکر خود صحابہ کے منہ سے نہ سُن لیتے تھے - ابن قیس کہتے ہیں ایک دفعہ میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ دمشق کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا اے ابوالدرداء میں مدینہ یعنی مدینۃ الرسول سے ایک حدیث (یا المشافہ) سننے کی غرض سے آپ کے پاس آیا ہوں جو مجھ تک پہونچی ہے (سنن الدارمی جزء ۱ صـ۸۳) مدینہ سے دمشق تک کے سفر کے مصائب برداشت کرنے کے بعد بھی وہ شخص حضرت ابوالدرداء سے سُنی ہوئی حدیث بھول جائے تو اُس شخص سے زیادہ احمق کوئی نہ ہوگا۔

صحابہ کرام تابعین اور محدثین احادیث سن کر اس پر عمل بھی کیا کرتے تھے زندگی کے ہر موڑ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و احکام کو سامنے رکھا کرتے تھے۔ آپس میں حدیث پر مذاکرات کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو حضورؐ کی احادیث سناتے رہتے تھے۔ سماع حدیث کے حلقے قائم رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے احادیث یاد رہتی تھیں۔ پھر اپنے شاگردوں کو بھی آپس میں مذاکرات کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے۔

تذاکروا الحدیث لا ینفلت منکم

(سنن الدارمی جزء ۱ صـ۱۲۰)

حدیث ایک دوسرے کو سناتے رہا کرو تاکہ وہ تم سے چھوٹ نہ جائے۔

حضرت ابوسعید خدری بھی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

تذاکروا الحدیث فان الحدیث یھیج الحدیث۔ (دارمی جزء ۱ صـ۱۱۹)

حدیث پر مذاکرے کرتے رہا کرو کیونکہ حدیث کا بیان کرنا حدیث کو یاد رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

ابن ابی لیلیٰ کہا کرتے تھے۔ تذاکروا الحدیث فان احیاء الحدیث مذاکرته - حدیث آپس میں بیان کرتے رہنا ہی اسے زندہ (یعنی یاد) رکھنا ہے۔ اسی طرح ایک روایت حضرت علقمہ سے مروی ہے (مقدمہ ابن الصلاح صـ۲۲۳)

اسی معنی میں ایک قول امام زہری۔ عطاء اور مجاہد سے بھی نقل ہوا ہے۔

ابراہیم النخعی نے فرمایا۔

من سرہ ان یحفظ الحدیث فلیحدث به ولو ان یحدث به من لا یشتھیه

جسکو حدیث یاد رکھنا اچھا لگے تو اس کو چاہئے کہ وہ حدیث بیان کرتا رہے چاہے ایسے شخص ہی کو

کیوں نہ سنائی جائے جو شخص پڑھ دل سے آمادہ نہ
ہو ۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص۲۲۸)

اس کے آگے امام ابن الصلاح لکھتے ہیں ۔ محدث کو چاہئے کہ وہ احادیث کی تخریج اور تصنیف و تالیف وغیرہ میں مصروف رہے
تاکہ احادیث اس کے حافظے میں محفوظ رہ سکیں ۔ امام ابوبکر خطیب بغدادی کہتے ہیں مذاکرہ حدیث سے حدیث حفظ رہتی ہے
(مقدمہ ابن الصلاح ص۲۲۵)

نقل حدیث کے معاملہ میں سلف بہت زیادہ احتیاط سے کام لیتے تھے بعض سلف تو صرف حافظے سے نقل شدہ حدیث
ہی کو معتبر قرار دیتے تھے ۔ لا حجۃ الا فیما رواہ الراوی من حفظہ وتذکرہ ۔ یعنی جس روایت کو راوی اپنے حافظے
سے روایت کرے صرف وہی قابل احتجاج ہے ۔ یہ مسلک امام مالک اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہما کا بیان کیا جاتا ہے ۔ شافعیہ میں
سے ابوبکر الصیدلانی مروزی بھی اسی طرف گئے ہیں ۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص۱۸۵)

محدثین جب اسناد کی جانچ پڑتال کرتے ہیں تو راوی کی عدالت کے بعد اس کے حافظے کو اہم خیال کیا جاتا ہے ۔ ہمیں بے شمار راویوں
کے نام ملتے ہیں جو ثقاہت و عدالت کی بلندیوں پر فائز ہیں ۔ مگر حافظہ کمزور ہونے کی وجہ سے محدثین نے انہیں قابل اعتنا نہیں سمجھا ۔ اس
لئے حدیث سننے سے پہلے وہ راوی کے حالات سے خوب واقفیت حاصل کرنا ضروری خیال کرتے تھے ۔ ابراہیم اور حسن اور ابوالعالیہ رحمہم اللہ
سے روایت ہے ۔ جب وہ کسی شخص کے پاس حدیث حاصل کرنے کی غرض سے جاتے تو اس کی نماز ، پابندی سنت اور ہیئت وغیرہ کی
جانچ پڑتال کرتے تھے ۔ (الدارمی جزء اص۱۱۵) طاؤس کہتے ہیں کہ دفعہ بشیر بن کعب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس حاضر ہوئے
اور حدیث بیان کرنے لگے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مجھے پہلی حدیث دوبارہ سناؤ (یعنی یہ کہ میں تمہارا حافظہ دیکھوں)

راویوں کے انتقاد میں حافظہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ جب محدثین راوی کی جروح و تعدیل پر بحث کرتے ہیں تو راوی
کے ضبط اور عدالت کے لحاظ سے ان الفاظ میں تعارف کرواتے ہیں ۔ ثقۃٌ حافظٌ یا ثبتٌ حافظٌ یا صدوقٌ حافظٌ و
وغیرہ اور اسی طرح ان کی جرح میں سیئ الحفظ یا لیس بقوی وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ اشعب کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے
سوال کیا ، کیا ایسے راوی سے حدیث لی جا سکتی ہے ۔ جس کا حافظہ قوی نہ ہو ؟ امام مالک نے فرمایا نہیں ۔
(اسعاف فی رجال الموطا ص۱۲)

آئمہ محدثین بہترین حافظہ اور یادداشت کے مالک تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں صرف حدیث کی حفاظت
کے لئے پیدا کیا تھا ۔ قوی الحافظہ ہونا تو محدث کی لازمی صفت ہے اور جو لوگ حدیث میں امامت کے رتبہ پہ فائز ہوئے ہیں ان کا
تو مثالی حافظہ تھا ۔ ہشام بن عبدالملک نے امام زہری سے کہا کہ وہ اس کے بیٹے کے لئے چند احادیث لکھوا دیں ——
—— انہوں نے ہشام کے کاتب کو چار سو احادیث املاء کرا دیں ۔ اور چلے گئے پھر (کسی دن) ہشام نے زہری سے کہا کہ ا
احادیث تو ضائع ہو گئی ہیں ۔ آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں انہوں نے پھر وہی احادیث املا کرا دیں ۔ ہشام وہی احادیث نکال لایا
کیا تو معلوم ہوا کہ امام موصوف نے ایک حرف بھی نہیں چھوڑا تھا ۔ دراصل ہشام نے امام زہری کا حافظہ آزمایا تھا ۔
(البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص۳۴۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا ابو الزعیزعہ جو مروان کا کاتب تھا کہتا ۔

مروان نے حضرت ابوہریرہ کو بلا بھیجا (تاکہ وہ ان سے حدیث سُنے) حضرت ابوہریرہؓ نے حدیث بیان کرنا شروع کردی مروان نے مجھے اپنے تخت کے پیچھے چھپا کر بٹھا دیا تاکہ میں وہ تمام احادیث لکھ لوں جو وہ بیان کریں۔ ایک سال گزرنے کے بعد مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کو پھر بلا بھیجا۔ وہی احادیث پھر سنیں بعد میں لکھی ہوئی احادیث سے مقابلہ کرتا رہا انہوں نے ایک حرف کا تغیر و تبدل نہیں کیا تھا۔ (الاصابہ فی اسماء الصحابہ لابن حجر ص۲۰۲ جلد ۴)

یہ قصے کہانیاں نہیں، مستند واقعات ہیں، ایسے واقعات جو ہر اعتبار سے صحیح، درست اور قابل اعتماد ہیں، کسی انسان کے قول و فعل کو یاد رکھنے کی جتنی امکانی کوششیں اور احتیاطیں کی جا سکتی ہیں وہ تمام کی تمام احادیث نبوی کے ضبط و حفظ میں اختیار کی گئیں۔ احادیث کو ان نفوس قدسیہ (صحابہ کرام) نے محفوظ اور یاد رکھا، جو حاملین قرآن تھے۔ اور جن کا اس پر ایمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت دین میں حجت ہے!

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ اس کی تعلیم کا منصب عظیم تفویض فرمایا تھا۔ "کتاب و حکمت" کی تعلیم ہی احادیث میں ملتی ہے، جو بدبخت "سنت نبوی" کو محض تاریخ سمجھتا ہے، اور اس کے دین میں حجت ہونے کا قائل نہیں ہے، وہ در اصل "منکر نبوت" ہے اور نبوت کا انکار کفر ہے!

اللہ تعالیٰ ہم سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی توفیق عنایت فرمائے کہ دین در اصل اطاعت رسولؐ ہی کا نام ہے۔

محمد نعیم ندوی صدیقی
رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

مؤطا امام مالک کے مستند ترین راوی یحییٰ مصمودیؒ

مؤطا کو امام مالک سے روایت کرنے والوں کی تعداد بقول شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی ایک ہزار ہے لیکن مؤطا کے جو نسخے مشہور و معتبر ہیں ان میں یحییٰ بن یحییٰ اللیثی المصمودی کا روایت کردہ نسخہ بھی ہے، بلکہ مصمودی کی روایت کو بالاتفاق معتبر اور مقبول ترین قرار دیا جاتا ہے اس کی شہرت کا اندازہ صرف اسی بات سے ہوسکتا ہے کہ آج مؤطا کا نام ذہن میں آتے ہی اسی نسخہ مصمودی ہی ہوتا ہے یحییٰ اپنے گوناگوں کمالات کی بنا پر امام مالک کے محبوب ترین تلامذہ میں تھے، اندلس میں مالکی مذہب کا چرچا انہی کی وجہ سے ہوا۔

نام ونسب یحییٰ نام اور ابو محمد کنیت تھی، پورا سلسلہ نسب یہ ہے یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر بن وسلاس بن شمل بن منغایا اللیثی طنجہ کے ایک مشہور بربری قبیلہ مصمودہ سے تعلق رکھتے تھے بنو لیث کے غلام تھے۔ ان کے اجداد میں وسلاس اور دیگر منغایا نے یزید بن عامر اللیثی کے دست حق پرست پر مشرف باسلام ہوئے تھے۔ انہی بزرگوں کی طرف منسوب ہوکر یحییٰ اللیثی کے نام سے شہرت پائی[2]

ولادت یحییٰ کے دادا کثیر (جن کی کنیت ابو عیسیٰ تھی) نے اندلس کو اپنا وطن ثانی بنا کر قرطبہ میں بود و باش اختیار کرلی تھی، ۱۵۲ھ میں یحییٰ کی ولادت ہوئی[3]

تحصیل علم شیخ یحییٰ نے سب سے پہلے قرطبہ ہی میں یحییٰ بن مضر الاندلسی سے احادیث کی سماعت کی اور پھر امام مالک کے تلمیذ رشید زیاد بن عبد الرحمن اللخمی سے پوری مؤطا کا سماع حاصل کیا۔ اس کے بعد طلب علم کے شدید جذبہ نے انہیں آمادہ سفر کیا اور وہ کشاں کشاں دیار نبوی پہونچے۔ ابن فرحون مالکی اور حافظ ابن عبد البر کا بیان ہے کہ اس وقت شیخ یحییٰ کی عمر صرف

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۴۲ [2] الدیباج المذہب ص ۳۵۰ [3] مقدمہ اوجز المسالک ص ۲۶ [4] الدیباج المذہب ص ۳۵ والانتقاء لابن عبد البر ص ۵۸

۲۰ سال کی تھی۔ لیکن صاحب اوجز کی تحقیق ہے کہ وہ ۲۸ سال کے تھے، اس لئے کہ شیخ یحییٰ کی ولادت ۱۵۲ھ میں ہوئی اور ۱۷۹ھ میں وہ سماع موطا کے لئے مدینہ آئے۔ اسی سال امام مالک کی وفات ہوئی[1]

مدینہ میں اس وقت امام مالک کے فیض کا دریا رواں تھا۔ مصمودی اس سے فیضیاب ہوئے اور موطا کی سماعت کی۔ لیکن ابھی امام مالک اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے اور "کتاب الاعتکاف" کے تین ابواب سماعت سے رہ گئے، اسی بنا پر یحییٰ ان ابواب کو زیاد کے واسطے سے روایت کرتے ہیں، بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ ابواب امام مالک کی وفات کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی اور مانع کی بنا پر سماعت سے رہ گئے اور امام مالک کی رحلت شیخ یحییٰ کے دوسری بار مدینہ آنے کے وقت ہوئی اس تحقیق کے مطابق ابن عبدالبر کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے کہ سماع موطا کے وقت مصمودی کی عمر اٹھارہ سال کی تھی اور اغلب ہے کہ جب مصمودی امام مالک کے انتقال کے وقت ان کی خدمت میں پہونچے ہوں تو عمر اٹھارہ سال رہی ہو۔

مصمودیؒ نے تحصیل علم کے لئے اندلس سے دو مرتبہ مشرق کا سفر کیا۔ پہلی مرتبہ میں انہوں نے امام مالک کے علاوہ سفیان بن عیینہ، لیث بن سعد، عبداللہ بن وہب اور نافع بن نعیم سے اکتساب علم کیا دوسرے علمی سفر میں انہوں نے ابن القاسم سے جو کہ امام مالک کے اعیان تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں، سماع حدیث کی[2]

شیوخ امام مالک کے علاوہ مصمودی کو جن کبار ائمہ سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا ان میں ممتاز اور مشہور نام یہ ہیں۔ یحییٰ بن مضر، زیاد بن عبدالرحمٰن، لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن وہب، ابن القاسم، قاسم بن عبداللہ العمری، ابی ضمرہ، انس بن عیاض۔

تلامذہ مصمودی کے منبع فیض سے جو لوگ مستفید ہوئے ان میں بقی بن مخلد محمد بن وضاح، محمد بن العباس، ابن الولید، صباح بن عبدالرحمٰن العتیق وغیرہم شامل ہیں[3]

علمی انہماک تحصیل علم کے لئے جس لگن، یکسوئی، انہماک اور ذوق و شوق کی احتیاج ہوتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھا، جب وہ امام مالک کی خدمت میں سماع کے لئے حاضر ہوئے تو دنیا و مافیہا سے بالکل کٹ کر اسی کے ہو رہے۔

چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار اثناء درس کسی نے کہا "ہاتھی آگیا" تمام شرکائے درس ہاتھی دیکھنے چلے گئے، لیکن یحییٰ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔ امام مالک نے تعجب سے دریافت کیا کہ "اندلس میں تو ہاتھی ہوتا ہی نہیں پھر تم کیوں نہیں دیکھنے گئے، شیخ یحییٰ نے اس کا جو جواب دیا وہ بلاشبہ ——— وہ درس و تدریس اور علمی انہماک کا عین عنوان بننے کے قابل ہے۔ فرمایا

لم ارحل لانظر الفیل وانما رحلت لاشاهدك واتعلم من علمك وهديك	میں یہاں ہاتھی دیکھنے کے لئے نہیں آیا میں تو یہاں اتنی دور سے صرف آپ کا فیض صحبت اٹھانے اور آپ کے علم و سیرت سے کچھ حاصل کرنا آیا ہوں۔

اپنے وقت شاگرد کے اس جواب کو سن کر امام مالک اتنا زیادہ خوش ہوئے کہ انہوں نے اسی وقت شیخ یحییٰ کو "عاقل اهل الاندلس" کا خطاب عطا کیا۔

---

[1] مقدمہ اوجز ص ۲۶ [2] الانتقاء لابن عبدالبر ص ۵۸ [3] تہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۱
[4] ابن خلکان ج ۳ ص ۱۴۳ و مقدمہ اوجز ص ۲۶

تفقہ روایت حدیث کے ساتھ شیخ یحییٰ کو فقہ میں بھی درجہ کمال حاصل تھا یہ تفقہ ان کی صلاحیت اور محنت کے ساتھ ساتھ امام اور سفیان بن عیینہ کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا، اندلس میں فقہ مالکی کی اشاعت میں اسد بن فرات، ابن حاتم اور عبد اللہ بن وہب کے ساتھ مصمودی کا بھی بڑا حصہ ہے حافظ ابن حجر انہیں " وہاں فقیہا حسن الرائی " لکھتے ہیں۔[1]

افتا مصمودی کے غیر معمولی تفقہ ہی کا نتیجہ تھا کہ اہل اندلس ان کے فتووں پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ اس فن میں ان کی مہارت مسلم تھی۔ محققین کا اتفاق ہے کہ یحییٰ جب مختلف ممالک سے تحصیل علم کرنے کے بعد واپس آئے تو علم کی ریاست (سرداری) ان پر ختم ہو گئی تھی۔

ابن خلکان لکھتے ہیں :۔

ان یحیی عاد الی الاندلس وانتهت الیه ریاسته بها وبه انتشر مذهب مالک فی تلک البلاد وتفقه به جماعة لا یحصون عدداً۔[2]	بلاشبہ یحییٰ اس حال میں اندلس واپس آئے کہ وہاں علم کی ریاست ان پر ختم تھی، یحییٰ ہی کے ذریعہ اندلس میں مالکی مذہب فروغ پذیر ہوا اور ان سے اتنے لوگوں نے تفقہ حاصل کیا جن کی تعداد کا حصر ممکن نہیں۔

حافظ ابن عبدالبر رقمطراز ہیں :۔

قدم الی الاندلس بعلم کثیر فدارت فتیا الاندلس بعد عیسی بن دینار الیه وانتهی السلطان والعامة الی رأیه۔[3]	یحییٰ کثیر علم کے ساتھ اندلس واپس آئے اندلس کے منصب افتا پر عیسیٰ بن دینار کے بعد وہی فائز ہوئے اور عوام و خواص سب آپ ہی کی رائے کی طرف رجوع کرتے تھے۔

حق گوئی و بیباکی فقہ و فتاوی میں ان کی جو رائے ہوتی تھی اس کا اظہار برملا فرماتے تھے اور اس میں کسی کے رعب و دبدبہ کی پروا نہیں کرتے تھے۔ حتی کہ دربار شاہی بھی انہیں مرعوب نہ کر سکتا تھا۔ ایک بار اندلس کے حاکم امیر عبدالرحمن بن حکم الاموی ماہ رمضان میں اپنی ایک محبوب لونڈی سے روزے کی حالت میں ہم بستر ہو گیا، چونکہ امیر میں دین کا احساس باقی تھا اس لئے اپنی اس اضطراری حرکت پر اسے شرمندگی اور کفارۂ معصیت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اس نے شہر کے تمام فقہا کو قصر شاہی میں طلب کر کے کفارہ کا مسئلہ دریافت کیا۔ یحییٰ مصمودی نے پوری جرأت اور بیباکی کے ساتھ فرمایا۔

"امیر کو پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنا چاہئیں"

شیخ یحییٰ کی جلالت علمی کی وجہ سے وہاں تو کسی فقیہ کو اختلاف کی مجال نہ ہو سکی۔ لیکن دربار سے واپس آنے کے بعد عرض کیا کہ "امام مالکؒ تو اس نوع کے مسائل میں خیار کے قائل ہیں یعنی ان کے نزدیک کفارہ صوم میں روزہ دار کو اختیار ہے چاہے غلام آزاد کرے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ پھر آپ نے دو ماہ کے روزوں ہی پر کیوں اصرار کیا؟"

یہ سن کر شیخ یحییٰ نے کتنا حکیمانہ جواب دیا۔

لو فتحنا له هذا الباب سهل علیه ان یطأ	اگر ہم نے امیر کے لئے یہ دروازہ کھول دیا تو اس کے لئے

---

۱ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۱ ۲ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۶ ۳ الانتقاء ص ۵۹

كل يوم و يعتق رقبة فيه ولكن حملته على اصعب الامرين لئلا يعود[1]

بہت آسان ہوگا کہ روزہ مجامعت کرے اور کفارہ میں کوئی غلام آزاد کردے لیکن میں نے اس کے لئے مشکل صورت اختیار کی تاکہ آئندہ وہ اس فعل کی جرأت نہ کرے

جامعیت شیخ یحییٰ مصمودی کی شخصیت گوناگوں اخلاقی، علمی، اور روحانی کمالات کا مجموعہ تھی۔ ان کے تبحر علمی اور جامعیت کو تمام محققین نے خراج تحسین پیش کیا ہے، ابن عماد حنبلی رقمطراز ہیں۔

وكان اماما كثير العلم كبير القدر وافر الحرمة كامل العقل خير النفس كثير العبادة والفضل.[2]

وہ کثیر العلم، عظیم المرتبت اور نہایت ہی محترم و موقر امام تھے، ان کی عقل کامل تھی نفس نیک اور بہت اچھا تھا زیادہ عبادت کرنے والے تھے۔

احمد بن خالد کا بیان ہے کہ

لم يعط احد من اهل العلم بالاندلس منذ دخلها الاسلام من الحظوة وعظم القدر وجلالة الذكر ما اعطيه يحيى بن يحيى[3]

جب سے اندلس میں اسلام داخل ہوا یہاں کے علماء میں سے کسی گروہ جاہ و جلال اور عظمت و برتری حاصل نہیں ہوئی جتنی یحییٰ بن یحییٰ (مصمودی) کو حاصل ہوئی

ابو الولید بن الفرضی کا قول ہے کہ یحییٰ مصمودی امام وقت اور یکتائے زمانہ تھے[4] ابن لبابہ کہتے ہیں کہ "اليه انتهت الرياسة بالعلم بالاندلس"[5]۔ علامہ مقری نے لکھا ہے کہ شیخ مصمودی کی روایت کو اس قدر مستند سمجھا جاتا تھا کہ مشرق کے علماء بھی اس سے استناد کرتے تھے[6]

جلالت شان یحییٰ مصمودی اپنے گوناگوں کمالات کی بنا پر جس طرح عوام میں غیر معمولی عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے اسی طرح خواص میں بھی ان کی بڑی توقیر کی جاتی تھی، حکومت کی جانب سے ان کو بارہا منصب قضا کی پیشکش کی گئی مگر انہوں نے بڑی شان استغناء کے ساتھ اسے نامنظور کر دیا۔ اس کی وجہ سے ان کی عزت و مرتبہ میں دوچند اضافہ ہوگیا، حتیٰ کہ سلطان وقت کی نگاہ میں ان کا مرتبہ اس درجہ بلند ہوگیا کہ ان کے مشورہ کے بغیر ملک کا کوئی اہم معاملہ سرانجام نہیں پاتا تھا یہاں تک کہ گورنروں کے عزل و نصب میں بھی ان کی رائے کو مقدم رکھا جاتا تھا۔

ابن القوطیہ کا بیان ہے کہ یحییٰ اپنے بے لاگ عدل و انصاف کی وجہ سے اندلس کے بادشاہوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے یہاں تک کہ جب تک وہ زندہ رہے اندلس میں کوئی قاضی ان کے مشورہ کے بغیر مقرر نہیں ہوتا تھا[7]

علامہ ابن حزم اندلسی فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی فقہ کی اشاعت قاضی ابو یوسف کے قاضی القضاۃ ہونے کی بنا پر ہوئی کیوں کہ یہ بلند عہدہ اور مخصوص علمی وقار کی وجہ سے اقصائے مشرق سے لیکر اقصائے افریقہ تک صرف وہی لوگ ذمہ دار منصبوں پر فائز کئے جاتے تھے جو قاضی ابو یوسف کے ہم رائے و ہم خیال ہوتے تھے، اسی طرح بلاد اندلس میں مالکی فقہ کی اشاعت یحییٰ مصمودی کے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے

---

[1] ابن خلکان ج ۳ ص ۲۰۴ [2] شذرات الذهب ج ۲ ص ۸۲ [3] الانتقاء لابن عبد البر ص ۶۰ [4] تهذيب التهذيب ج ۱۱ ص ۳۰۱ [5] الديباج المذهب ص ۳۵۱ [6] نفح الطیب ج ۱ ص ۲۹۰ [7] افتتاح الاندلس ص ۵۸

ہوئی۔ سلطان وقت حکام کے عزل ونصب میں ان ہی سے مشورہ کرتا تھا۔ چنانچہ وہ عہدوں پر تقرری کے لئے انہی علماء کو ترجیح دیتے جو امام مالک کے مسلک کے پابند ہوتے تھے [1]

علامہ سیوطی نے ابن حزم کے مذکورہ بالا قول کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بلاد مغرب میں صرف مصمودی کے روایت کردہ نسخہ کے مقبول ہونے کا اصل سبب یہی ہے [2]۔

مسلک — جیسا کہ اوپر مذکور ہوا یحییٰ مصمودی کو امام مالک سے غایت درجہ عقیدت ومحبت تھی، اسی بنا پر وہ مالکی مسلک کی شد سے اتباع کرتے تھے۔ حالانکہ اس زمانہ میں کسی ایک مذہب کی پابندی کا دستور رائج نہ تھا۔

لیکن۔ ــــــ یحییٰ مصمودی مالکی مسلک کی کامل اتباع کے باوجود چار مسائل میں امام مالک سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان مسائل میں ان کا جداگانہ مسلک یہ تھا،

۱۔ صبح کے وقت قنوت نہیں ہے۔

۲۔ شاہد مع الیمین (قسم کے ساتھ ایک گواہ) اثبات حق کے لئے ناکافی ہے مدعی کو اپنا حق ثابت کرنے کے لئے دو مرد گواہ یا ایک مرد اور دو عورتیں پیش کرنا لازمی ہے۔

۳۔ شوہر اور بیوی کے نزاع وشقاق کی صورت میں حکمین کو صلح کرانے کا حق نہیں۔

۴۔ زمین کے کرایہ کا مسئلہ۔

مذکورہ بالا چاروں مسئلوں میں وہ لیث بن سعد کے مسلک کے قائل تھے [3]

حلیہ — مصمودی شکل وہیئت کے اعتبار سے اپنے شیخ امام مالک سے حد درجہ مشابہت رکھتے تھے۔ وہی سرخ وسپید رنگ، بالاقد بھاری بدن، کشادہ پیشانی، بڑی آنکھیں، اونچی ناک گھنی اور بڑی ڈاڑھی تھی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رقمطراز ہیں۔

در وضع لباس ونشست وبرخاست وہیئت ظاہری نیز شبیہ حضرت امام مالک می نمود [4]	وضع قطع، اٹھنے بیٹھنے کے طریقے، ظاہری شکل وصورت اور اتباع میں امام مالک کی ہو بہو تصویر تھے۔

مورخ ابن خلکان اور ابن فرحون مالکی بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں،

وکان قد اخذ فی نفسہ وہیئتہ ومقعدہ ہیئۃ مالک [5]	وہ اپنی شکل وصورت اور نشست وبرخاست میں امام مالک کے ہم صورت ومتبع تھے۔

تقویٰ وطہارت — اللہ تعالیٰ نے ان کو علم کے ساتھ عمل کی بھی توفیق عطا کی تھی۔ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ ابن بشکوال کا قول ہے کہ "وکان مستجاب الدعوات [6]"

حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ

وکان یاتی الجامع یوم الجمعۃ راجلا متعمما [7]	وہ جمعہ کے دن جامع مسجد عمامہ باندھ کر پیدل چل کر آتے تھے۔

---

[1] بحوالہ بستان المحدثین ص [2] تزیین الممالک ص ۵۶ [3] الانتقاء لابن عبدالبر ص ۶۰ [4] بستان المحدثین ص ۱۲ [5] ابن خلکان ج ۳ ص ۲۷۶، والدیباج المذہب ص ۳۵۱ [6] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۱ [7] الانتقاء ص ۶۰

وفات ۲۲ رجب ۲۳۴ھ کو علم و فضل کا یہ نیر تاباں غروب ہو گیا، جس نے اپنی ضیا گستری سے نصف صدی سے بھی زائد عرصہ تک اندلس کو منور رکھا تھا[1]۔ اس وقت ان کی عمر ۸۲ سال کی تھی[2]۔ ان کی قبر قرطبہ کے قبرستان بنی عامر میں زیارت گاہ خلائق ہے[3]۔

مؤطا نسخۂ مصمودی کی خصوصیات شیخ یحییٰ مصمودی کا سب سے بڑا کارنامہ امام مالک کی مؤطا کی سماعت و حفاظت ہے جس نے بلاشبہ انہیں تاریخ علم و فن میں حیات جاوداں عطا کی ہے۔

امام مالک سے یوں تو سینکڑوں لوگوں نے مؤطا کا سماع کیا لیکن ان سب نے امام صاحب کی مرویات کو محفوظ نہیں کیا صرف تلامذہ نے اپنی روایت کے مطابق مؤطا کو جمع کیا، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:-

یحییٰ بن یحییٰ مصمودی، عبد اللہ بن وہب، ابن القاسم، عبد اللہ بن مسلمہ قعنبی، معن بن عیسیٰ، یحییٰ بن بکیر، سعید بن عفیر، ابو مصعب زہری، مصعب بن عبد اللہ زبیری، سلیمان بن برد، ابو حذافہ السہمی، سوید بن سعید، امام محمد بن حسن شیبانی، یحییٰ بن یحییٰ التمیمی، عبد اللہ بن یوسف دمشقی۔ محمد بن مبارک

مؤطا کے ۱۶ نسخوں میں مشہور اور متداول صرف دو نسخے ہیں، ایک مصمودی کا دوسرا امام محمد کا۔ لیکن ان دونوں میں بھی نسخہ مصمودی کو زیادہ شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی۔ حتیٰ کہ آج ساری دنیا میں مؤطا کا اطلاق نسخۂ مصمودی ہی پر ہوتا ہے۔

اس نسخہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ امام مالک کی وفات کے وقت زیر سماعت تھا، کیونکہ جیسا اوپر مذکور ہوا، یحییٰ مصمودی نے اس کا سماع امام مالک سے اسی سال کیا جس سال ان کی رحلت ہوئی، اس طرح وہ مؤطا کے دیگر تمام نسخوں میں آخری قرار پاتا ہے اور ظاہر ہے آخری سماع کو مرجح قرار دیا جائے گا۔

دوسری نمایاں خصوصیت اس کی یہ ہے کہ یہ بہت سے ایسے فرعی مسائل پر مشتمل ہے جو کہ باب میں مذکور روایت کے مطابق ہیں۔ ان خصوصیات کے باوجود یحییٰ مصمودی کی روایات میں اوہام زیادہ ہیں، اس لئے وہ کتب ستہ میں جگہ نہ پا سکیں[4]۔

بعض محققین مؤطا امام محمد کو نسخۂ مصمودی پر کئی وجوہ سے فوقیت دیتے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں محدث زاہد الکوثری کی یہ رائے بڑی ہی معتدل اور نہایت حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے کہ دونوں نسخے اپنی جداگانہ خصوصیات میں باہم دگر فوقیت رکھتے ہیں، وہ رقمطراز ہیں:-

"اس دور میں مؤطا کی مشہور ترین روایت اہل مشرق میں امام محمد بن حسن کی روایت ہے اور اہل مغرب میں یحییٰ اللیثی کی۔ پہلی روایت کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں اہل عراق نے مؤطا میں مدونہ جن احادیث اہل حجاز کو لیا ہے اور جن کو دوسرے دلائل کی بنا پر جو امام محمد اپنی مؤطا میں لائے ہیں، نہیں لیا ہے، ان کا بیان ہے، اور یہ چیز ان لوگوں کے لئے نہایت مفید ہے جو اہل مدینہ اور اہل عراق کے اجتہادی مسائل اور فریقین کے دلائل کا باہم موازنہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسری روایت مؤطا کی تمام روایتوں میں اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ وہ تین ہزار کے قریب امام مالک کے ان اجتہادی مسائل پر مشتمل ہے جن کا تعلق فقہ کے مختلف ابواب سے ہے

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

---

[1] ابن خلکان ج ۳ ص ۲۲۱ [2] العبر فی خبر من غبر ص ۴۱۹ [3] ابن خلکان ج ۳ ص ۱۴۵ [4]

KIWI
BLACK
KIWI
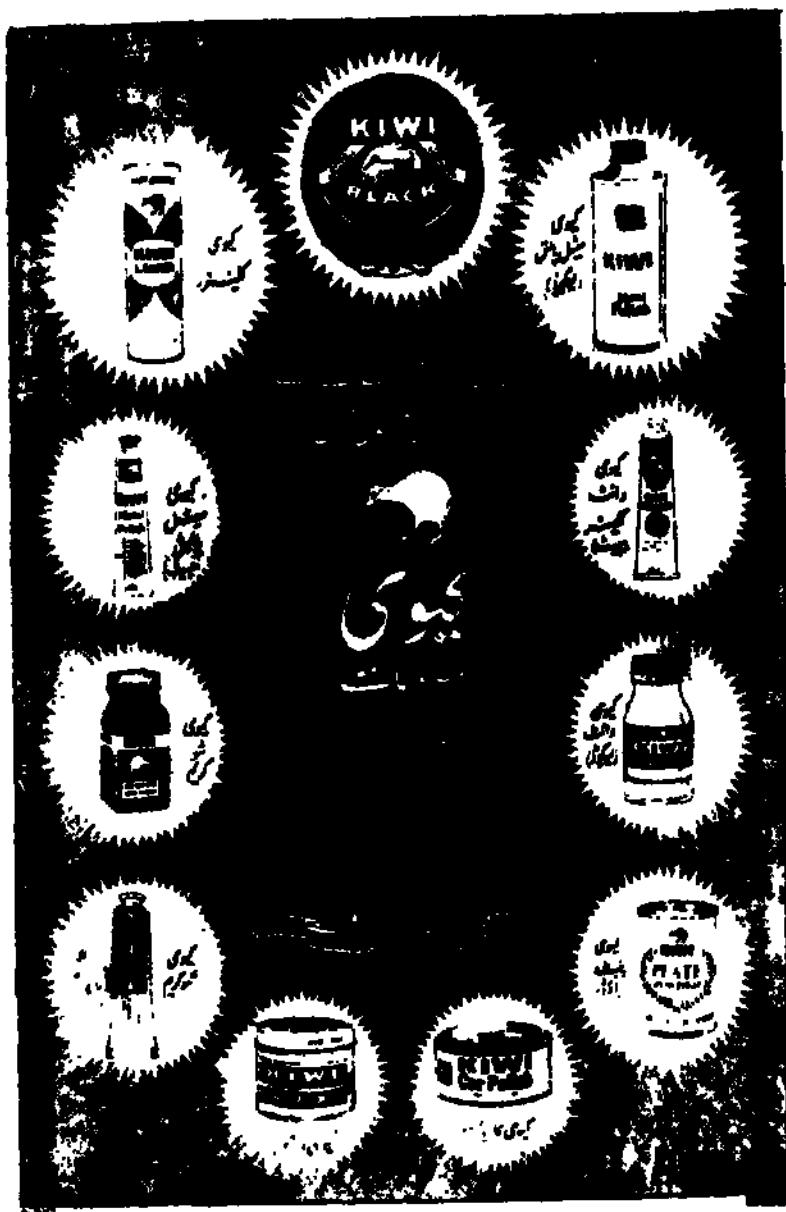
جناب مُلّا واحدی کے خطوط سید اوصاف علی دہلوی (بی۔اے) کے نام

سید اوصاف علی صاحب، جناب ملّا واحدی کے بھائی کے نواسے ہیں، وہ میری درخواست پر ملا صاحب موصوف کے بہت سے خطوط لے آئے تھے، میں نے اُن میں سے چند خط چُن لئے، جو قارئین "فاران" کے مطالعہ کے لئے درج کئے جاتے ہیں۔ (م۔ق)

(۱)

للہ نظام المشائخ، ناظم آباد کراچی ۳۳

(۱۱ر جمادی الثانی ۱۳۸۴ھ) ۱۸ر اکتوبر ۶۴ء

عزیزم! علیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ۔ عرف عام میں جنہیں بڑا آدمی کہا جاتا ہے، وہ حقیقتاً بڑے آدمی نہیں ہوتے، بڑے دولت مند، بڑے ذی علم، بڑے سیاست داں، بڑے مدبر وغیرہ وغیرہ ہوتے ہیں۔ بڑا آدمی وہ ہے جسے اللہ بڑا تسلیم کرے۔ اللہ نے اس کا معیار بتا دیا ہے کہ میں مکرم صرف اسے سمجھتا ہوں جو متقی ہے۔ جتنا جو متقی ہوگا اتنا وہ مکرم اور معزز اور بڑا انسان ہوگا۔ متقی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی سے بنا جاتا ہے۔

مضمون کے لئے سفارش لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مضمون اپنی سفارش خود کیا کرتے ہیں۔

دعاگو واحدی

(۲)

بسم اللہ (۵ر شعبان ۱۳۸۴ھ) ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۴ء

عزیزم! علیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

اولیا کو مثل انبیا۔ اگر کسی نے لکھا ہے تو میرے نزدیک اچھا نہیں کیا۔ اللہ معاف فرمائے۔ اولیا کی انتہا انبیا کی

ابتدا نہیں ہے انبیا سے غیر نبی کو کوئی نسبت ہی نہیں دی جاسکتی۔ صحابہ کے علاوہ اوروں کے لیے رضی اللہ عنہ لکھنا بھی میں سمجھتا ہوں کہ غلط بات ہے۔ علیہ الرحمہ یا رحمۃ اللہ علیہ لکھنا چاہیے۔ اپنے والدین کو میرا سلام کہو۔

دعاگو واحدی

(۳)

بسم اللہ (۹ رشعبان ۱۳۸۴ھ) ۱۴ دسمبر ۶۴ء

عزیزم! علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مولانا محمد علی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ واقعی اللہ کے پرستار تھے۔ اُنہوں نے مہاتما گاندھی کا ایسا ساتھ دیا کہ گاندھی جی کی کامیابی اور ہندوستان کی آزادی میں اُن سے زیادہ کسی اور کا ہاتھ نہیں ہے۔ مولانا محمد علی ساتھ نہ دیتے تو آزادی کے حصول میں مسلمانوں کی گاندھی جی کو مدد نہ ملتی اور آزادی کچھ عرصے اور ٹلی رہتی۔ لیکن خیر مولانا محمد علی نے جب دیکھا کہ ہندو مسلمانوں پر غلبہ رکھنا چاہتے ہیں تو گاندھی جی سے بھی علیحدگی اختیار کرلی اور ہندوؤں میں جو اثر قائم کیا تھا اُسے بھی قربان کردیا اور پاکستان کی بنیاد ڈال دی۔ مولانا محمد علی گاندھی جی کو نہ چھوڑتے تو پاکستان بننا مشکل تھا۔

خیر طلب واحدی

(۴)

بسم اللہ (۱۸ رشعبان ۱۳۸۴ھ) ۲۳ دسمبر ۶۴ء

عزیزم! علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ گاندھی جی اپنی قوم کی بھلائی چاہتے تھے تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں تھی۔ ایسے لیڈر بھی کہاں ہیں جو اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہوں۔ سید محفوظ علی شرفائے بدایوں میں سے تھے مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کی منیجری کرنے دلی آئے تھے۔ ہمدرد کے اجرا میں دیر لگی تو واپس چلے گئے مولوی عبدالحلیم شرر کو مولانا محمد علی نے ایڈیٹری کے لیے بلایا تھا۔ وہ بھی ہمدرد کے نکلنے کا انتظار نہیں کرسکے۔ یہ دونوں حضرات قیام دلی کے زمانے میں میرے ہاں خواجہ صاحب سے ملنے اکثر آیا کرتے تھے۔ میری پہلی شادی میں شریک تھے۔ سید محفوظ علی نے بہت تھوڑا لکھا ہے مگر جتنا لکھا ہے لاجواب لکھا ہے۔

خواجہ صاحب اور سردار صاحب کی لڑائی کا قصہ، پورا میں خواجہ صاحب کی سوانح عمری میں لکھ چکا ہوں۔

اپنے والدین کو میرا سلام کہو۔ دعاگو واحدی

(۵)

بسم اللہ (۲۰ رجمادی الثانی ۱۳۸۷ھ) ۲۵ ستمبر ۱۹۶۷ء

عزیزم! علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تم نے انگریز شاعر کی نظم کا مفہوم بہت اچھی طرح بیان کیا ہے۔

اللہ کی مخلوق سے محبت کرنا اللہ ہی سے محبت کرنا ہے۔ محبت کے معنی ہیں اللہ کی ہدایات کے مطابق مخلوق کے ساتھ برتاؤ برتنا۔ محبت سب کے ساتھ یکساں نہیں کی جاتی۔ ماں باپ کے ساتھ محبت اور قسم کی ہوتی ہے بیوی کے ساتھ اور قسم کی۔ اولاد کے ساتھ اور قسم کی، نامسلمانوں کے ساتھ اور قسم کی وغیرہ وغیرہ ——————

زن کے ساتھ اور قسم کی، جانوروں کے ساتھ اور قسم کی۔

دعاگو واحدی

(۶)

بسم اللہ

(۱۵ رشعبان ۱۳۸۷ ؛ ۱۸ رنومبر ۱۹۶۷ء)

عزیزم! علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں نے تمہارے مضامین پڑھ لئے ہیں اور اُن پر اظہارِ مسرت بھی کر دیا۔

میرے لئے عمرِ نوح ملنے کی دعا کبھی مت مانگنا۔ مجھے تو مرنے کے بعد کی وہ زندگی مطلوب ہے جس کا مومنوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ زندگی مطلوب کیا، ہر وقت اُس زندگی کا منتظر ہوں اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ موجودہ زندگی سے بیزار ہوں اور موجودہ زندگی کی ناقدری کرتا ہوں۔ موجودہ زندگی کو بھی نعمت سمجھتا ہوں۔ لیکن عمرِ نوح حضرت نوحؑ کا حصہ ہے۔

اپنے والدین کو میرا سلام کہو

دعاگو واحدی

(۷)

بسم اللہ

۱۶ رمحرم ۱۳۸۸ھ (۱۵ راپریل ۱۹۶۸ء)

عزیزم! علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

نثرِ خواجہ حسن نظامی علیہ الرحمہ کی ایک خصوصیت تو یہ ہے جس کی میں پیروی کرتا ہوں، یعنی سادگی۔ دوسری خصوصیت ان کی والہانہ انشاء پردازی تھی۔ مثلاً قاہرہ پہونچ کر فرعونِ موسیٰ کی لاش دیکھتے ہیں تو اُس سے خطاب فرماتے ہیں۔ "اُٹھ، چل، وسکی کا ایک ایک جام پئیں . . . . . . " اسی کو نثر کی شاعری کہا جاتا ہے اور یہ نثر کی ایسی شاعری ہے، میں جسے خواجہ صاحب پر ختم سمجھتا ہوں۔ مولانا حسرت موہانی سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو نثر کا شاعر خواجہ صاحب کو سب سے پہلے اُنہوں نے کہا تھا۔ ملاقات کا حال ہلال میں چھپ چکا ہے اور تم تعجب کروگے، ویسے خواجہ صاحب شعر و شاعری سے بالکل بیگانہ تھے۔ اُن کی تحریروں میں شعر تمہیں کبھی نہیں ملیں گے اُنہوں نے تہجد کی مناجات کے عنوان سے ایک نظم حفیظ جالندھری سے لکھوا کر شائع کی تھی اُس کے آخر میں کچھ شعر خود بھی بڑھا دئے ہیں۔ جن کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔ شعر خواجہ صاحب کو بس اکبر الہ آبادی کے دو چار یاد تھے، وہ بھی صحیح نہیں پڑھتے تھے۔

دعاگو واحدی

(۸)

بسم اللہ

۱۱ رذی قعدہ ۱۳۸۷ (۱۱ رفروری ۱۹۶۸ء)

عزیزم! السلام علیکم

تم زبانی بھی کہتے رہتے ہو اور خطوں میں بھی اکثر لکھتے ہو کہ میں اپنا افسانہ یعنی اپنی سوانح عمری مکمل کروں۔ آج میں سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون کی کتاب "ناقابلِ فراموش" پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ میری زندگی میں سوانح ہیں کہاں جو سوانحِ زندگی کی تکمیل کی جائے۔ میری زندگی تو بالکل یکساں اور بغیر حوادث اور آثار کے گزری ہے زیادہ سے زیادہ اُسے چند ادوار DECADES میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۸۸ سے ۱۸۹۶ء یا

۱۸۹۴ تک دلی سے باہر والد ماجد کے ساتھ یو پی کے جنگلوں میں وقت کٹا۔ وہاں جتنی تعلیم پانی ممکن تھی اتنی تعلیم پائی۔ ۱۸۹۶ یا ۱۸۹۷ میں مجھے والدہ ماجدہ سمیت دلی پہنچا دیا گیا۔ پانچویں جماعت سے اسکول میں داخل ہونے کا پروگرام بنا۔ گھر پر دو سال کے اندر اندر چار سال کا کورس ختم کیا۔ ۱۹۰۲ میں آٹھویں جماعت یعنی مڈل کا امتحان دینے بیٹھا۔ ۱۹۰۰ تک مڈل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لیتی تھی۔ والد ماجد کا خیال تھا کہ مڈل دلی میں پاس کرائیں گے انٹرینس (جسے بعد میں میٹرک کہنے لگے تھے) اناوہ ہائی اسکول میں، اور بی۔ اے علی گڑھ کالج میں۔ پھر بیرسٹری سیکھنے انگلستان روانہ کر دیں گے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۰۱ کو والد ماجد رحلت فرما گئے۔ ادھر میں کورس کی کتابوں سے زیادہ مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی وغیرہ حضرات کی کتابوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تاہم ۱۹۰۷ سے پہلے بیرسٹری کا خواب یکسر نہیں چھوٹا تھا۔ یہ دو دور DECADE ہوئے۔ ایک ۱۸۸۸ سے ۱۸۹۶-۹۷ تک، دوسرا ۱۸۹۶-۹۷ سے ۱۹۰۷ تک۔ تیسرا دور ۱۹۰۷ سے ۱۹۳۲ تک کا تھا۔ ۱۹۰۷ سے پہلے ایل۔ ایل۔ بی کے داخلے میں تو بی۔ اے کی شرط تھی۔ بیرسٹری کے داخلے میں بھی بی۔ اے کی شرط لگ گئی۔ میں انٹرینس ہی پاس نہ کر سکا، بی۔ اے کیا کرتا۔ دوسرے طبیعت آزاد اور حالی وغیرہ کی کتابوں میں لگنے لگی۔ کورس کی کتابوں سے اُچاٹ ہو گئی۔ لکھنے کا چسکا پڑ گیا۔ ماہنامہ زبان (دلی) سہ روزہ وکیل (امرتسر)، ہفت نامہ وطن (لاہور) روزنامہ پیسہ اخبار (لاہور) میں آرٹیکل بھیجنا شروع کیا جو لکھا، وہ چھپا۔ اس سے حوصلہ بڑھا۔ ادھر خواجہ حسن نظامی مل گئے۔ اُنہوں نے بیرسٹری کی پٹری کا کانٹا موڑ دیا اور صحافت کی پٹری پر ڈال دیا۔ ۱۹۰۹ میں خواجہ صاحب کی شرکت میں ماہنامہ نظام المشائخ نکالا۔ اُس وقت میری عمر اکیس سال تھی۔ اور خواجہ صاحب کی عمر اکتیس سال۔ خواجہ صاحب کی ۱۲۹۶ھ کی پیدائش اور میری ۱۰ رمضان ۱۳۰۵ھ مطابق ۷ مئی ۱۸۸۸ عیسوی کی پیدائش۔ خواجہ صاحب مضامین نویسی میں بھی مجھ سے آٹھ نو برس سینیر تھے۔ آٹھ نو برس میں خواجہ صاحب نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا جو مجھے تریسٹھ سال کی مضامین نویسی کے بعد بھی حاصل نہیں ہے۔ خواجہ صاحب آفتاب کی طرح چمکنے والے تھے۔ اُن کی شعاعوں نے مجھے بھی روشنی بخشی۔ نظام المشائخ خوب چلا۔ ۱۹۱۳ میں حکیم اجمل خاں نے مجھ سے ہفت نامہ طبیب جاری کرایا۔ اور خواجہ صاحب نے نظام المشائخ کا مجھ کو تنہا مالک و ایڈیٹر بنا دیا اور خود بھتیجا احسان الحق کے ہفت نامہ توحید کی ایڈیٹری کرنے میرٹھ چلے گئے۔

۱۹۰۷ سے ۱۹۳۴ تک کے دور کا میرا کارنامہ ہے تو فقط یہ کہ خواجہ صاحب مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام اور مولانا ظفر علی خاں کے شریک سفر ہونا چاہتے تھے میں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ کا میدان سیاست نہیں ہے تصنیف و تالیف ہے اور مولانا راشد الخیری سے کہا کہ صبح زندگی ناحق کر گوشۂ گمنامی میں کیوں جا چھپے۔ زبردستی اُن سے متعدد کتابیں تصنیف کرائیں۔ انسان کی خمیر قلم سان پر رکھوا دی اور مولانا عارف ہسوی کو ہفت نامہ انقلاب کی ایڈیٹری سپرد کر کے سیاست کے جوہر دکھانے کا راستہ کھولا۔ باقی اس دور کا خلاصہ بس اس قدر ہے کہ سویرے سویرے اُٹھنا، نماز پڑھنی، چار پانچ میل کی ہوا خوری کی اور پھر سونے کے وقت تک بیل کی طرح کام میں جتا رہا۔ ہفت ناموں پہ ہفت نامے، ماہناموں پہ ماہنامے اس دور میں میری زیر نگرانی شائع ہوئے۔ خود لکھنے کی فرصت نہ رہی دوسروں کا لکھا دیکھنے اور انتظام و انصرام کرنے میں صبح سے شام ہو جاتی تھی۔ اس دور کی اپنی چار کتابوں کے نام یاد ہیں۔ ایک جاماسپ نامہ، دوسری بزم فرید۔ بزم فرید حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے ملفوظات

"راحت القلوب" مرتبہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا ترجمہ ہے۔ جاماسپ نامہ بھی ترجمہ تھا۔ تیسری مجالس حسنہ اس میں خواجہ حسن نظامی کی چند مجلسوں کے تاثرات ہیں۔ چوتھی مضامین واحدی۔ میرے اُس وقت تک کے مضامین کا مجموعہ۔

۱۹۰۷ء سے ۱۹۳۴ء تک کا دور کاروباری اعتبار سے نہایت کامیاب دور تھا۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء تک میں دلی میونسپل کمیٹی کا مسلسل ممبر رہا۔ اس نئی مصروفیت نے کاروبار تباہ کر دیا، حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء میں راشن افسری قبول کرنی پڑی۔ وہ اگرچہ بطور ملازم نہیں دی گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کی ممبری کرنے اور کاروبار جاری رکھنے کی مجھے اجازت تھی، لیکن بہرحال ملازمت تھی۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور کو چوتھا دور سمجھو۔ ۱۹۴۷ء سے تادم تحریر کراچی میں ہوں۔ یہ پانچواں دور ہے اس دور میں لکھنے اور پڑھنے یا پڑھنے اور لکھنے کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں ہے ایسے میں حاصل زندگی کہتا ہوں۔ اس دور میں میں نے حیات سرور کائنات ؐ کے تین حصے لکھے، میرے زمانے کی دلی لکھی سوانح عمری خواجہ حسن نظامی لکھی "تاثرات" کے عنوان سے بارہ تیرہ سو چھوٹے بڑے مضمون لکھ ڈالے۔ یکم جنوری ۱۹۶۵ء کو "میرا افسانہ" لکھنا شروع کیا تھا۔ ۱۱۵ یا ۱۲۵ صفحے "میرے افسانے" کے ٹائپ ہو چکے تھے، ۱۲ فروری ۱۹۶۵ء کو وہی لکھ رہا تھا کہ بائیں جانب فالج گرا۔ بائیں دست و بازو اور بائیں ٹانگ کی گویا موت آگئی۔ دل نے آواز دی کہ اللہ رسول ؐ کا ذکر کرنے کی بجائے اپنا افسانہ کیا لے بیٹھا تھا۔ یہ تیری عمر اور یہ ڈینگیں۔ خیراب دائیں دست و بازو اور دائیں ٹانگ کو غنیمت جان، اور قلم کا صحیح استعمال کرتا رہ۔ میرے پاس اب نہ تیسرے دور کی کوئی کتاب ہے اور نہ پانچویں دور کی۔

آج بھی جب کہ موت کا ہر آن منتظر ہوں زندگی کا حال حسب سابق ہے۔ علی الصباح جاگ جانا اور نماز اور پہلی قدمی (حقیقتاً پہلی قدمی) سے فارغ ہو کر سونے کے وقت تک لکھنا پڑھنا۔ موت کے انتظار کے ساتھ لکھنے پڑھنے کی پوری امنگ اللہ کا بڑا انعام ہے۔

خیر تمہیں بتانا یہ تھا کہ سوانحعمری لکھنے کے لئے واقعات ایسے ہونے چاہئیں۔ جیسے سردار دیوان سنگھ مفتون کو پیش آئے۔ میری زندگی عمل سے تو خالی نہیں رہی مگر معرکۃ الآرا عمل میری زندگی میں مفقود ہیں۔ سادہ باتوں کو جتنا چاہوں بڑھا چڑھا سکتا ہوں۔ میرے افسانے کے ۱۱۵ یا ۱۲۵ ٹائپ شدہ صفحے میں نے دوسروں کے ذکر سے بھر دئے ہیں بقول میرے داماد قیسی صاحب کے تیرے افسانے میں بہت سے آدمی مل گئے لیکن آپ نہیں ملے! طولانی کرنے کو تو میں نے اس خط ہی کو کتنا طولانی کر دیا۔

آخر میں اتنا اور سن لو اور گرہ میں باندھ لو کہ لوگوں کے ساتھ بھلائیاں کی ہوں یا نہ کی ہوں بھلائی کرنے کا جذبہ ہمیشہ رکھا، برائی کرنے کے جذبے سے ہمیشہ پاک رہا دور کے ڈھول تو سہاونے ہوتے ہی ہیں، مجھ سے میرے گردوپیش کے آدمی محبت کرتے تھے۔ میرے دوست، میرے پڑوسی، میرے محلے والے۔ دوست ایسے ملے کہ ایسے دوست اللہ سب کو دے دشمن میرا کوئی نہیں ہوا۔ تمہارے لئے اتنا ہی سبق کافی ہے۔

میری روش نامناسب تھی تو اللہ مجھے معاف فرمائے اور مناسب تھی تو یہ اللہ کا کرم تھا ؎
جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے اُس کے　　　اور جو ہوگا اُسی کے کرم سے ہوگا

اتنا طویل خط میں نے

از:۔ ڈاکٹر محمد ریاض
ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی (تہران)

دیارِ سعدیؔ میں

راقم الحروف ان چند طالب علموں میں سے ایک ہے جو ۱۹۶۵ء کے اواخر میں ایرانی حکومت کے وظیفہ پر فارسی زبان و ادب کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے تہران گئے تھے۔ وہاں تحقیق و تدقیق کے ساتھ ساتھ صبح و شام کی کلاسوں میں باقاعدہ تدریس بھی کی جاتی رہی ہے، تعطیلات کے دوران ہم اس حسین اور تاریخی ملک کے مختلف شہروں میں سیر و تفریح کرنے اور تاریخی مقامات کو دیکھنے کی فرصت کو غنیمت جانتے تھے اس وسیع و عریض ملک کے سارے شہروں کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرنا تو مشکل ہے البتہ یہاں کچھ یادیں درج کی جاتی ہیں۔

میرے سہ سالہ قیام کے دوران کا زیادہ تر وقت تہران ہی میں گزرا۔ وہی تہران جسے اقبالؔ ممالک مشرق کا جنیوا بنانا چاہتے تھے۔

طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

ایک دو بار کی فرصت مشرقی اور شمالی ایران دیکھا یعنی زاہدان، مشہد، بابل، آمل، چالوس، رشت اور قزوین کے معروف اور دلآویز شہر ایک دوسری فرصت میں چند دن ہمدان کا قیام رہا۔ میں یہاں حاجی ڈاکٹر محمد صدیق خان صاحب کے ساتھ اس غرض سے بھیج آیا تھا کہ اپنے تحقیقی مقالہ کی خاطر حضرت میر سید علی ہمدانی (۷۱۴ھ ۔ ۷۸۶ھ) کے بارے میں کچھ مقامی روایات اور معلومات جمع کر سکوں۔ اس ضمن میں، خاصی کامیابی رہی، دو مزید فرصتوں میں قمؔ، کاشان، اصفہان اور شیراز وغیرہ جانا ہوا میں وہاں سے ان شہروں کے ناقابل فراموش تاثرات لے کر آیا ہوں۔

اصفہان اور شیراز کا علمی سفر میں نے گذشتہ سال اکتوبر کے آخری اور نومبر کے پہلے ہفتہ میں کیا۔ حاجی سید حسین جعفر حلیم صاحب میرے رفیق سفر تھے۔ ہم تہران سے سیدھے شیراز پہنچے راستے میں موسم خاصہ سرد معلوم ہو رہا تھا اور خیال تھا کہ شیراز میں جب منہ اندھیرے پہونچیں گے تو بہت سردی کا سامنا ہوگا ـــ لیکن ایسا نہ ہوا۔ صبح کے ۵ بجے ذرا سمتانی ہوا مگر فضائے شیراز میں ایک خاص اعتدال اور طراوت کا عالم محسوس ہوا میں نے بے اختیار اپنے ساتھی کو سعدیؔ اور حافظؔ کے یہ دو شعر سنائے

بادِ صبح و خاکِ شیراز آتشی است ہر کرا در وی گرفت، آرام نیست
خوشا شیراز و وضع بی مثالش خداوندا نگہدار از زوالش

شیراز، ادبیات فارسی کا مرکز و محور ہے۔ بزرگان شیراز کی عقیدت کی بنا پر مجھے اس شہر سے عجیب قسم محبت اور لگاؤ ہے، انس

ی ـــــ اور فارسی ادبیات کے تمام شیدائیوں کو آتی ہی ہے، علامہ اقبال نے بھی اپنی " نوا " اسی شہر سے منسوب کی ہے ؎

تنم گلی زخیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

جدید ایران کے سب ہی شہر خوبصورت ہیں سڑکیں کشادہ اور سیدھی ہیں پیچ و خم مشکل ہی سے کہیں نظر آتا ہے یہی وجہ ہے
ٹریفک کے حادثے نہ ہونے کے برابر ہیں ان شہروں میں شیراز کی رونق اور بہار سب سے زیادہ دلکش اور روح پرور ہے ،
سعدی نے سچ فرمایا ہے ، کہ کو شہرہا ہمہ باز کند شہر ما شہباز
س شہر میں انسانی حسن اور مناظر کا قدرتی حسن دونوں عجیب ہیں ۔

نسیم خلد شیراز و لعبستان بہشتی	زہر دریچہ نگہ کن کہ حور بینی و عین را (سعدی)

لربے چارے حافظ نے شیراز کو اصفہان پر ترجیح دی : " ترکانِ شیرازی " کی اداؤں پر سمرقند و بخارا کو نثار کرنا چاہا تو
و قابل ملامت نہیں ہے اس لئے کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا ؎

اگرچہ زندہ رود آب حیات است	دل شیراز ما از اصفہان بہ
اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را	بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را
شیراز و آب رکنی وآں باد خوش نسیم	عیبش مکن کہ خال رخ ہفت کشور است

" خال رخ ہفت کشور " گل و گلزار کی ایک وادی ہے سبزہ و گل ہیں اور انواع و اقسام کے اشجار ۔ لوگ بے حد خوش اخلاق
ور مہمان نواز ہیں ۔ فارسی کی اصطلاح میں " غریب " (مسافر) نواز بھی ہیں ؎

بہ شیراز آی و فیض روح القدس	بجوی از مردم صاحب کمالش (حافظ)
چو پاکان شیراز خاکی نہاد	ندیدم کہ رحمت برین خاک باد (سعدی)

ایک لطیفہ :ـــ ایران میں مرچ کھانے کا رواج نہیں ہے ہری مرچ کھاتے ہیں تو وہ بھی " سلاد " کے طور پر یہ مرچ تند و تیز نہیں
ہوتی ۔ مگر شیراز میں جہاں کہیں بھی ہری مرچ کھائی وہ ہماری مرچوں کی مانند بے حد تند تھی ۔ ایک دن ایک " گارسن " (بیرے)
سے بات کی کہ یہ مرچ کہاں سے لاتے ہو ؟ " بیرے " نے ہمیں پاکستانی جان کر مذاق کیا ، کہا ۔ مرچ تو شیرازی ہے مگر اس کا بیج
تو سعدی ہندوستان سے لایا تھا ۔ مزید بات چیت سے معلوم ہوا کہ بیرا صاحب " بوستان " کی اس حکایت سے آگاہ ہے ،
جس میں سعدی نے اپنے سفر ہند کے عجائب و غرائب بیان کئے ہیں ۔ خاصی دلچسپ کی باتیں معلوم ہوئیں اس لئے کہ سعدی نے
تو ہمارے ہاں کی مرچ کا ذکر کیا ہے ؎

گل آورد سعدی سوی بوستان	بشوخی و فلفل بہندوستان

شیراز میں سعدی و حافظ کے مزارات کے علاوہ کئی معروف اور دیدنی مقامات ہیں ، محلات ، باغات ، تاریخی چیزیں
شاہ چراغ کا مزار وغیرہ ۔ دوسرے اکابر کے مزاروں کی وہ شہرت نہیں ہے ۔ بمشکل پتہ چلتا ہے کہ شیخ روزبہان بقلی ، علامہ
ی اور علامہ دوانی کہاں مدفون ہیں ؟ حافظ کے عظیم پیشرو خواجو کرمانی (وفات ۷۵۳ ، ہجری) کا مزار دروازہ شہر کے پاس
واقع ہے مگر پوچھنے اور دریافت کرنے ہی سے اس کا پتہ چلتا ہے ۔
بجا یہ کہ سعدی و حافظ کی شہرت نے دوسرے اکابر کی ناموری کے چراغ مدھم کر دئے ہیں ؎

جڑا ہوا ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

چلتے پھرتے بیشتر انہیں کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔ ایک ایک بڑی سڑک انہی کے نام پر ہے۔ بہر کتنی گلیاں کوچے اور دکانیں بھی
نام "گلستان" اور "بوستان" یا حافظ کے بعض محبوب الفاظ پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً مصلیٰ اور رکن آباد وغیرہ پر۔ ایران
بھی دوسرے اکثر ممالک کی مانند اکابر واعیان کے مجسمے جگہ جگہ موجود ہیں مگر شیراز۔ اس سے مستثنیٰ ہے وہاں دروازہ
کے قریب صرف ایک مجسمہ ہے اور وہ سعدی کا ہے اس شہر سے تقریباً ۴۰ میل دور "اصفہان۔ شیراز شاہراہ" پر
"تخت جمشید" کے کھنڈرات موجود ہیں۔ یہ مقام اب بھی ایران کے قدیم باجبروت بادشاہوں کی قوت و شکوہ کا مظہر ہے

شیراز کی "پہلوی یونیورسٹی" کا شمار اب براعظم ایشیا کی اچھی درسگاہوں میں ہونے لگا ہے۔ چند ماہ قبل
کے جوان ڈاکٹروں نے قلب انسانی کے پیوند کا کامیاب تجربہ کر کے یونیورسٹی کو اور بھی معروف کر دیا ہے۔ اس درسگاہ کا ذریعہ ت
انگریزی ہے، قرب وجوار کے ممالک (خصوصاً عرب ممالک) کے طلبا کی ایک کثیر تعداد یہاں زیر تعلیم ہے۔ شہنشاہ ایران
یونیورسٹی کو ایک مثالی درسگاہ بنانے میں ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس یونیورسٹی کے پہلو میں نامور شاعر خواجہ حافظ شیرا
مزار ہے۔

حافظ (وفات ۷۹۲ ہجری) کا جدید مزار تقریباً تیس سال پہلے بنا ہے مزار وسیع و فراخ اور دیدہ زیب ہے،
گرد کی دوسری قبروں کی بنا پر عجیب تنگی کا احساس ہوتا ہے ایک گوشے میں حد بندی کر کے ناصر الدین شاہ قاچار کے وزیر قوام
شیرازی (وفات ۱۳۴۱ ھ) نے زندگی میں ہی اپنا مزار بنوایا تھا، وہاں وہ اور اُس کے اہل خاندان دفن ہیں یہاں سے تھو
دور پہ نامور شاعر وصال شیرازی کا مزار ہے، دوسرے کونے پر "قائم حافظ" اور سعدل شیرازی مع اہل وعیال مدفون ہیں
پر سعدل شیرازی کی جمع کی ہوئی کتابوں کا ایک ذخیرہ بھی موجود ہے۔

حافظ کی قبر دالان کے وسط میں کھلی جگہ واقع ہے۔ قبر اس کے احاطے میں جو تھوڑے بہت اشعار مرقوم ہیں ان کے
کی روشنائی مدھم ہو چکی ہے۔ جس جگہ حافظ کا مزار واقع ہے اسے "خاک مصلیٰ" یا مخفف طور پر صرف "مصلیٰ" کہتے ہیں
سے تھوڑی دور پہ "رکنا آباد" ہے جہاں حافظ کے عہد میں چھوٹی نہر یعنی رود خانہ تھا۔ اب بھی اس نہر کے آثار موجود
تھوڑا سا پانی بھی ہے جو بارش کے زمانے میں بڑھ جاتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں خواجہ حافظ خوش گذرانی کرنے "کی
سے شغل فرمانے اور وہاں کی "گلگشت" (تفریح) سے بہرہ مند ہونے کو جنت کی زندگی پر ترجیح دیتے تھے ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکناباد و گلگشت مصلیٰ را

اب یہ سارا علاقہ "حافظیہ" کہلاتا ہے یہاں سے گذرنے والی سڑک بھی "خیابان حافظ" (HAFIZ ROAD)
کہلاتی ہے۔ یہاں سے کافی آگے چلنے کے بعد بلند سا مقام آتا ہے جسے "سعدیہ" کہتے ہیں۔ یہاں ایران کا سب سے بڑا شاعر
ادیب سعدی محو خواب ہے، سعدی یہاں وعظ و ارشاد کی محفلیں گرم کیا کرتے تھے۔ ایک خانقاہ بھی تھی جس کے آثار باقی
اور اس کے نیچے مچھلیوں کا خوبصورت تالاب بنایا گیا ہے۔

"سعدیہ" شیراز کے شہر کا آخری حصہ ہے اور ایک اچھی خاصی تفریح گاہ ہے۔ سعدی (وفات ۶۹۵ ہجری) کا
حافظ کے مزار کے تقریباً سولہ سال بعد تعمیر ہوا، سعدی کی شخصیت کے پیش نظر نہایت خوش نما، وسیع اور جاذب نظر بنایا گیا

ن طوسی، حکیم عمر خیام، اور عطار نیشاپوری، بابا طاہر عریاں ہمدانی اور حکیم ابو علی سینا کا کے مزاروں کی بھی یہی حالت
زار سعدی کی عمارت اور اس کا احاطہ انواع و اقسام کے پھولوں اور پھلدار درختوں سے بھرا ہوا ہے دروازے پر
ثبت ہے :-

ز خاک سعدی شیراز بوئے عشق آید / ہزار سال پس از مرگ گرش بوئی

دروازے سے داخل ہو کر گلستان و بوستان سے گزرنا پڑتا ہے اس کے بعد مزار کا دالان ہے اور آخر میں وہ کمرہ جہاں
ی کی پرشکوہ قبر ہے، دالان کے ایک جانب چھوٹا سا کتاب خانہ ہے اور کتاب خانہ والے کمرے کی ایک دیوار پر شوریدہ شیرازی
ہے اصل میں یہاں شوریدہ کی قبر تھی جو دیوار کے نیچے آگئی۔ صرف لوحِ مزار نمایاں ہے۔ آئیے اس شوریدہ کو ذرا پہچان لیں۔
شوریدہ شیرازی (۱۲۷۴ - ۱۳۴۵ ہجری قمری) کا نام محمد تقی اور لقب فصیح الملک تھا! اسے سعدی سے بے پناہ عقیدت
شوریدہ کی وصیت کے مطابق اُسے یہاں دفن کیا گیا ہے۔ شوریدہ نابینا تھا۔ سات برس کا تھا کہ چیچک کے مرض میں مبتلا ہوا اور
جاتی رہی، شاعری کا ملکہ خداداد تھا غزل اور قصیدے اچھے کہے ہیں۔ خاص کر قصیدے کا استاد مانا جاتا ہے اشعار کے نمونے
درج کئے جا رہے ہیں یہ شعر اس شاعر نے ۱۳۲۴ھ میں اُس وقت کہے جب بڑھاپے میں اُس کے لڑکا پیدا ہوا ہے۔

ہم خوابہ من دوش برایم پسری زاد / نور بصری، بہر من بے بصری زاد
ایں کلبہ ویرانہ من با بچہ ی گشت / زان بچہ سروی قد و زان سرو بری زاد
از گریہ او شب ہمہ شب دوش نخفتم / پیداست ز شوریدہ کہ شوریدہ سری زاد
نہ ہر کہ بزاید پسری در خور فخر است / یعنی پسر او زاد کہ از وی ہنری زاد

ان اشعار میں لفظ "دوش" غور طلب ہے۔ ہمارے ہاں یہ لفظ "گذشتہ کل" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر ایران میں "گزشتہ رات"
(LAST NIGHT) کے معنی میں۔ وہاں "امشب و دوش" کہنے کا رواج ہے مگر ہمارے یہاں "امروز و دوش" یا "دوش"
بولتے ہیں۔

ایران کے نامور محقق استاد ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے اپنی وزارت کے دوران حافظ اور سعدی کے مزارات بنوائے ہیں۔ سعدی کے
ار کی ایک خاص بات نظم و نثر کا وہ انتخاب ہے جو مصنف کے تصانیف سے انتخاب کر کے لوحِ مزار اور دیواروں پر عمدہ
خط میں مرقوم کرایا گیا ہے۔
سعدی کی قبر والے کمرے سے باہر ۲۲ اشعار اُس قصیدے میں سے انتخاب کر کے ثبت کئے گئے ہیں جو شیخ نے امیر انکیانو کے لئے
اندرز کی خاطر لکھا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

بسی صورت بگردید است عالم / وزیں صورت بگردد عاقبت ہم
عمارت با سرای دیگر انداز / کہ دنیا را اساسی نیست محکم
بسیم و زر نکو نامی بدست آر / نہ بر ہم کو بگیرندش از ہم
وفاداری مجوے از دہر خونخوار / محالست انگبیں در کام ارقم
حواشش باد ملک و پادشاہی / کہ پیشش مدح گویند در قفا ذم

د کے بالائی حصے پر ۱۴ اشعار نقش کئے گئے ہیں ان مواعظانہ و حکیمانہ اشعار میں سے چند ملاحظہ ہوں :-

خوش است عمر، دریغا کہ جاودانی نیست / پس اعتماد بریں پنج روز فانی نیست
چو حاجت است عیاں را باستماع بیان / کہ بے وفائی دور فلک نہانی نیست
کدام باد بہاری وزید در آفاق / کہ باز در عقبش نکبت خزانی نیست
دلا رفیق دریں کاروانسرائے مبند / کہ خانہ ساختن آئین کاروانی نیست
طریق حق رو و در ہر کجا کہ خواہی باش / کہ کنج خلوت صاحبدلاں مکانی نیست
نگاہ دار زباں تا بدوزخت نبرد / کہ از زباں بتر اندر جہاں زیانی نیست
زبوں بہ تیغ بلاغت گرفتہ اے سعدی / سپاس دار کہ جز فیض آسمانی نیست

اب اُس کمرے کا اندرونی منظر دیکھئے جس میں بزرگوار سعدیؒ کی قبر موجود ہے، کمرہ خاصہ وسیع ہے کمرے کے وسط پر قبر ہے، قبر پر قرآنی آیات کے علاوہ شاعر کی کہی ہوئی نعت رسولؐ اور منقبت آل رسولؐ بھی منقوش ہے۔ سعدی شافعی مسلک پر تھے۔ اور منقبت کے اشعار بھی اس نقوش کے آئینہ دار ہیں ان میں کے چند اشعار ـــ

کریم السجایا، جمیل الشیم / نبی البرایا، شفیع الامم
امام رسل پیشوائے سبیل / امین خدا، مہبط جبرئیلؑ
شفیع الوریٰ، خواجہ بعث و نشر / امام الہدیٰ، صدر دیوان حشر
شفیع، مطاع، نبی، کریم / قسیم، جسیم، نسیم، وسیم
نماند بہ عصیاں کسے در گرو / کہ دارد چنیں سیدی پیشرو

کس را چہ زور و زہرہ کہ وصفِ علیؓ کند / جبار در مناقب او گفتہ "ہل اتیٰ"
مردیکہ در مصاف زرہ پیش بستہ بود / تا پیش دشمناں ندہد پشت در غزا
دیباچہ مروت و سلطان معرفت / لشکر کش فتوت و سردار اتقیاء

خدایا بحق بنی فاطمہؓ / کہ بر قول ایماں کنم خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی، ور قبول / من و دست و داماں آل رسولؐ

در دروی سے قبر کے دست راست پر "بدایع سعدی" میں سے انیس اشعار والی غزل مرقوم ہے اس معروف غزل کے چند ابیات نقل کئے جاتے ہیں ـــ

اے صوفی سرگرداں در بند نکونامی / تا درد نیاشامی، زیں درد نیارامی
زہدت بچہ کار آید گر راندۂ درگاہی / کفرت چہ زیاں دارد گر نیک سرانجامی
بیچارۂ توفیقند، ہم صالح و ہم طالح / درماندۂ تقدیرند ہم عارف و ہم عامی
کام ہمہ دنیا را بر ہیچ منہ سعدی / چوں بادگری باید پرداخت بناکامی
گر عاقل و ہشیاری وز دل خبری داری / تا آدمیت خوانند، ورنہ کم از انعامی

اس غزل کے نیچے "گلستان" لاثانی میں سے ایک مختصر حکایت منقول و منقوش کی گئی ہے۔
"یاد دارم کہ در ایام طفولیت متعبد بودمی (الخ)۔ یہ "گلستان" کے دوسرے باب کی ساتویں حکایت ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ شیخ بچپن میں عابد و زاہد اور شب زندہ دار تھے۔ ایک رات وہ اپنے والد کے ساتھ عبادت و ریاضت، شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید میں مصروف تھے۔ قریب ہی کئی لوگ خوب مزے کی گہری نیند سو رہے تھے۔ شیخ نے والد صاحب سے کہا، یہ لوگ کتنے غافل ہیں۔ غفلت نے ان پر معنوی مرگ طاری کر رکھی ہے اور کسی کو ذکر الٰہی کی اہمیت کا پاس نہیں ہے والد نے جواب میں کہا، لوگوں کی غیبت کرنے کے بجائے اگر تو بھی سو جاتا تو بہتر تھا غیبت اور خودستائی غفلت سے بھی بدتر ہے ؎

نبیند مدعی جز خویشتن را　　　که دارد پردهٔ پندار در پیش
گرت چشم خدا بینی ببخشند　　　نبینی هیچ کس عاجزتر از خویش

قبر کی بائیں طرف یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

اگر مرا بدعائی مدد کنی شاید　　　که آفرین خدا بر روان سعدی باد

پھر نیچے "بوستان" میں سے چھ شعر درج کئے گئے ہیں، آغاز اس بیت سے ہے۔

الا اے کہ بر خاک ما بگذری　　　کہ بر استخوانش نروید گلی

عربی اور فارسی قصائد کے دوسرے متفرق اشعار بھی منقوش نہیں دوسری سمت "طیبات سعدی" میں سے ایک عارفانہ اور متکلمانہ غزل رقم کی گئی ہے۔

به جهان خرم از آنم که جهان خرم از اوست　　　عاشقم بر همه عالم که "همه عالم از اوست"
به غنیمت شمر اے دوست دم عیسیٰ صبح　　　تا دل مرده مگر زنده کنی کاین دم از اوست
نه فلک راست مسلم نه ملک را حاصل　　　آنچه است در سر سویدای بنی آدم از اوست
به حلاوت بخورم زهر که شاهد ساقی است　　　به ارادت ببرم درد که درمان هم از اوست
زخم خونینم اگر به نشود به باشد　　　خنک آن زخم که هر لحظه مرا مرهم از اوست
غم و شادی بر عارف چه تفاوت دارد　　　ساقیا باده بده شادی آن کاین غم از اوست
پادشاہی و گدائی بر ما یکسان است　　　که برین در همه را پشت عبادت خم از اوست
سعدیا گر بکند سیل فنا خانهٔ عمر　　　دل قوی دار که بنیاد بقا محکم از اوست

شیراز سے واپسی پر ہم نے چند دن اصفہان میں قیام کیا بڑا باعظمت اور تاریخی شہر ہے۔ تقریباً ہر گلی کوچے میں کوئی نہ کوئی تاریخی مقام اور تاریخی یادگار موجود ہے۔ صفوی دور حکومت کی چیزیں بڑی عمدگی سے محفوظ کی گئی ہیں یہاں سب کچھ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس شہر کو "نصف جہان" کیوں کہا جاتا رہا ہے؟ چہل ستون، مسجد شیخ لطف اللہ، مسجد شاہ عباس کبیر، پل خواجو، عجائب گھر اور منار جنبان پر عجائب روزگار کا گمان ہوتا ہے۔ ہمایوں کے لئے شاہ طہماسپ صفوی کی ضیافت اور نادر شاہ کے حملہ دہلی کی قلمی تصاویر دیکھ کر سارا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے "منار جنبان" ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کی عمارت ہے۔ عمارت کی چھت پر دو مینار ہیں۔ ایک مینار کو حرکت دینے سے ساری عمارت بھی ہلنے لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمارت یہ گری وہ گری۔

اصفہان کی ایک تازہ عمارت مرزا محمد علی صائب تبریزی کا مزار ہے۔ آج سے چالیس سال پہلے تک صرف بعض تاریخوں میں ذکر ملتا تھا کہ صائب کا مزار اصفہان میں ہے۔ ایران کے نامور معاصر محقق اور فاضل، استاد جلال الدین ہمائی اصفہانی سنا کی کوششوں سے مزار کا پتہ چلا اور وہ تعمیر بھی ہو گیا۔ انہوں نے چالیس سال قبل ایک باغبان کی مدد سے صائب کی لوح کو ڈھونڈ نکالا، اصفہانیان با صفا اور محکمہ آثار قدیمہ کے مشترک سرمایہ سے یہ شاندار عمارت اور اس کا وسیع احاطہ و باغ تین سال میں تیار ہوا ہے استاد ہمائی سنا کا ایک قصیدہ لوح مزار پر کندہ ہے مزار سنگ سرخ اور مرمر کا بنایا ہے اور تقریباً سات لاکھ تومان اس کی تعمیر پر خرچ ہوئے ہیں۔ صائب کی تاریخ وفات ۱۰۸۱ سے ۱۰۸۷ ہجری تک سالوں درمیان مختلف فیہ رہی ہے۔ آخری تحقیق یہ ہے کہ صائب کی وفات سنہ ۱۰۸۶ھ میں ہوئی۔

صائب، تبریزی ہو یا اصفہانی "سبک ہندی" کے شعرا کا گل سرسبد ہے۔ استاد امیری فیروزکوہی نے شاعر کو متعارف کرانے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اصفہانیوں نے صائب کی جو قدردانی کی، اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں اس شہر کی قابل ذکر باتیں ہیں مگر دیار سعدی، شیراز کے احترام میں فی الحال اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

(صا۲ کا بقیہ)

اور یہ دونوں روایتیں دنیا کے کتب خانوں میں شرقاً و غرباً نہایت کثرت سے موجود ہیں[۱]..."

تاہم —— آج موطا امام مالک کے نام سے جو کتاب بالخصوص ہندوستان میں مروج ہے وہ بن یحییٰ مصمودی ہی کی روایت کردہ ہے اور اسی کی شرحیں زرقانی، ابن عبدالبر، سیوطی اور شاہ ولی اللہ وغیرہم نے لکھی ہیں یہ چیز —— بجائے خود اس کی مقبولیت، شہرت اور استناد کی روشن دلیل ہے۔

الاستاذ سعید رمضان
ترجمہ :- مولانا عبدالمجید اصلاحی

نشان راہ

(۲)

نظام حکومت

حکومت کے ضوابط کی تعیین کرتے ہوئے اسلام تین اوصاف سے ممتاز ہے ۔

۱- کتاب وسنت نے حکومت کی کوئی مخصوص شکل متعین نہیں کی ہے ہاں انہوں نے ایسے اصول بیان کر دئیے ہیں جو صورت خواہ کچھ ہو لیکن حکومت کا مزاج متعین کر دیتے ہیں ۔ صورت کی تعیین کا معاملہ ہر زمانہ کے حالات علوم و معارف کی ترقی کے ساتھ تغیر و تبدل باشندوں کی تعداد میں اضافہ ، ملک اسلامی کے حیطۂ اقتدار کی وسعت ، وسائل و ذرائع کی فراوانی اور اظہار رائے وغیرہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے [1]

خلافت راشدہ کے لیے حاکم کے انتخاب میں کتنے مختلف طریقے اختیار کئے گئے ، سقیفہ بنی ساعدہ کی کانفرنس جو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے بلائی گئی تھی ، ایک ایسی شکل پیش کرتی ہے جو اس صورت سے بالکل مختلف تھی جو حضرت عمرؓ کے انتخاب کے لیے اختیار کی گئی تھی اسی طرح یہ دونوں شکلیں قطعی مختلف تھیں اس شکل سے جو انتخاب خلیفہ کے لئے چھ شخصوں کی نامزدگی کی صورت میں سامنے آئی ۔

جن لوگوں کو دستوری قانون اور دنیا میں نظامہائے حکومت کی تاریخ کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ بلند ترین حکمت کیا ہے جو نظام اسلامی کی مذکورہ بالا بے مثال خوبی کے اندر نظر آتی ہے ۔

۲- " اسلام " (جس کا حامل اسلامی معاشرہ ہوتا ہے) کا مطلب یہ ہے کہ سماج زندگی کے تمام گوشوں پر اللہ تعالیٰ کی بالادستی تسلیم کرے ۔ " ان الحکم الا للہ " پس جس بات کا حکم دیا گیا ہو اور جسے رسولؐ نے پہونچایا ہو وہ واجب الاطاعت ہے اس میں کسی طرح کا کوئی اختلاف نہ ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے نفاذ کی ذمہ داری سارے مسلمان جماعت کی گردن پر رکھی ہے ، تنہا کسی ایک فرد ، خاندان یا گروہ یا سوسائٹی پر نہیں رکھی ہے ۔ قرآن میں تشریعی خطاب دو صیغوں کے درمیان گھومتا ہے اس کے لئے تیسرا اور کوئی صیغہ نہیں ہے " یا ایھا النبی " اور " یا ایھا الذین امنوا " آنحضورؐ نے اللہ کا مکمل پیغام پہونچا دیا ہے اور اللہ نے اسکی گواہی بھی دی :

" الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً " ۔

---

[1] اسلام کے نظام حکومت کو بہرحال " شورائیت " کا مظہر ہونا چاہئے (م - ق)

اس کے بعد معاملہ اس مسلمان جماعت کی گردن پر جاتا ہے جس کی ذمہ داری اللہ نے انبیاء کی ذمہ داری کے برابر رکھی ہے

۔ فلنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین ۔[1]

بنا برایں جس شخص کو امت اسلامیہ اپنا امیر بنائے گی وہ رسول کی جگہ ہوگا اور اپنا اقتدار حاصل کریگا[2] وہ امیر محض امت کے انتخاب اور رضا سے ہوگا[3] وہ اسے اپنا امیر اسی لئے بنائے گی کہ اللہ اور رسول کی منشا کے مطابق امت کی گاڑی کھینچے گا اگر وہ اس راہ سے انحراف کرے گا اور دوسری راہ اختیار کرے گا تو خائن قرار پائے گا اور اس کا اقتدار سلب ہو جائے گا[4] امت اگر اس کے انتخاب اور اس کی نگرانی میں کوتاہی سے کام لے گی تو وہ اللہ کی امانت میں خیانت کی مرتکب ہوگی[5] اور اگر وہ ماسوی کو اپنا بادشاہ تسلیم کرے گی تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے گی[6]

۳۔ دوسری خوبی سے اسلام کی تیسری خوبی نکلتی ہے اور وہ یہ کہ امت اگرچہ حاکم کے انتخاب اس کی نگرانی اور زندگی کے جملہ تصرفات میں مرجع ہے جسے موجودہ نمائندہ حکومت کی زبان میں "الامۃ مصدر السلطات" (قوم اقتدار کا سرچشمہ ہے) کہا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے زیر سایہ امت اپنا وجود اس حقیقت سے قائم رکھ سکتی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دیا ہے اور وہ اس کے سامنے جوابدہ ہے اس لئے اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرے اللہ نے اس کے لئے نقوش راہ اپنی کتاب اور اپنے رسول کی سنت میں متعین کر دئے ہیں اس کے بعد اس نے کتاب و سنت کی تنفیذ[7] اور .... کا معاملہ امت کے حوالے کر دیا ہے۔ تاکہ وہ ہر نئے مسئلہ میں کتاب و سنت کی اسپرٹ کے مطابق کوئی راہ اختیار کرے[8]

بالفاظ دیگر کتاب و سنت کی تشریعات میں امت کو حق حاصل نہیں ہے کہ ان میں سے ذرہ برابر کمی بیشی کرے اور اہل شوریٰ میں نمائندہ کی حیثیت سے کوئی ایسا قانون جاری نہ کرے جو کتاب و سنت کے نصوص سے متصادم ہوتا ہو۔

غالباً یہ آخری خوبی بھی موجودہ دستوری نظاموں کے لئے انوکھی نہ ہوگی جہاں یہ معروف ہے کہ بعض دستوروں میں کچھ مستثنیات قرار دے جاتیں جن کی تعدیل ممکن نہ ہوتی ہو۔

---

[1] الذین ارسل الیھم سے مراد وہ لوگ بھی ہیں جو مسلمان ہیں، یہ اپنے ایمان وغیرہ کے ذمہ دار ہیں اور وہ لوگ بھی ہیں جو دلیل و حجت کے باوجود ایمان نہیں لائے[2] حتیٰ کہ اسی زمانہ میں جنہوں نے اقتدار وراثت کی بنیاد پر سنبھالا وہ بھی حق وراثت کی بنیاد پر حکومت کی قانونی حیثیت تعیین نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وراثت کے لئے امت کی رضامندی حاصل کرتے تھے اور وارث کو امت کی رضامندی کا تصور کرتے تھے۔[3] ابویعلیٰ کی کتاب "الاحکام السلطانیۃ" میں آیا ہے کہ بیعت کا طریقہ یہ ہے "ہم نے خوشی سے بیعت کی، عدل و انصاف اور امامت کے فرائض کی ادائیگی کے لئے بیعت کی"[4] آنحضور کا ارشاد گرامی ہے "مسلمان شخص پر سمع و طاعت ہے خواہ پسند ہو یا ناپسند الا معصیت کا حکم دیا جائے تو ایسی صورت میں سمع و طاعت نہیں ہے[5] (ابوداؤد) اور ترمذی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں مبتلا کر دے گا[6] منبر خلافت پر آنے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے خطبہ میں فرمایا ہے۔ "اما بعد! تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا اور نہ قرآن کے بعد کوئی کتاب آئیگی اللہ نے جس چیز کو حلال کر دیا ہے وہ قیامت تک کے لئے حلال ہے اور جسے حرام کر دیا ہے وہ قیامت تک کے لئے حرام ہے دیکھو میں قاضی نہیں ہوں بلکہ نفاذ کرنے والا ہوں۔ دیکھو میں بدعتی نہیں ہوں بلکہ متبع ہوں کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کی معصیت میں مطاع ہو اور دیکھو میں تم سے بہتر نہیں ہوں بلکہ تمہارے اندر کا ایک شخص ہوں ہاں اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر تم سے بڑا بوجھ رکھا ہے" (بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر)

عام ضابطے

۱۔ شوریٰ ـ یہ وہ بنیاد ہے جس کی متقاضی سیاست حکومت کی خوبیوں میں سے دوسری خوبی ہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ قرآن
نت کے ساتھ اللہ کا قول پیش کرتا ہے " وامرھم شوریٰ بینھم " شہ (ان کا کام باہمی مشاورت سے ہوتا ہے) ہر تنظیم جس طرح
موہ وسائل سے واسطہ پڑتا ہو اپنا قانونی حیثیت اسی طرح حاصل کرتی ہے کہ اس کی بنیاد باہمی مشاورت پر قائم ہوتی ہے چنانچہ
ن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی ضابطہ کی جانب توجہ دلائی جہاں پر کہیں وحی کا حکم نہ پایا جاتا ہو تو "۔ شاورھم فی الامر"
کام میں ان سے مشورہ لیا کرو ہم دیکھتے ہیں کہ مقام بدر جاؤ پہ بدر میں معرکہ آرائی سے پیشتر حضورؐ اپنے ساتھیوں کو جمع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں
گو! مجھے مشورہ دو" اور جب خروج کے پڑاؤ ڈالنے کی جگہ کے متعلق مسئلہ آیا تو اس سلسلہ میں آپ نے اپنے خیال سے ہٹ کر حباب بن
منذ کا خیال اختیار فرمایا پھر آپ اُحد کے میدان میں صحابہ کرام کے مشورے سے متاثر ہو کر تشریف لائے بعد کو خلفاء راشدین اسی طرز پر
لرتے رہے چنانچہ یہ آنحضورؐ کے ساتھیوں سے انفرادی اور اجتماعی ملاقاتوں میں مشورہ حاصل کیا کرتے تھے۔

صاف بات ہے کہ یہ بنیاد کسی محدود صورت کی حامل نہیں ہے جس کی موجودگی میں ہر زمانہ میں امت کی رائے معلوم کی جاسکے۔ یہ
ممکن ہے کہ موجودہ انتخابی نظام کے ساتھ رائے دہندگان کو اپنی رائے کے اظہار میں آزادی دی جائے اور ان شرائط کو بھی ملحوظ رکھا
ئے جن کا امت کی نمائندگی کے امیدواروں میں شہ زیادہ سے زیادہ پایا جانا ضروری ہے تو یہ نظام قابل عمل ہو سکتا ہے۔

(نوٹ) شہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضورؐ کی یہ تقریر ہے۔
" لوگو! میری بات سنو! میں نہیں جانتا کہ اس سال کے بعد اس جگہ پھر کبھی تم سے ملوں گا۔ پس لوگو! میری بات سمجھو میں پہونچا رہا ہوں میں نے
رے درمیان ایک چیز چھوڑی ہے کہ اگر اس کو مضبوطی سے پکڑے رہوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، کھلی ہوئی بات ہے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی
ت۔ ہاں دیکھو پہونچا یا نہ؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ گواہ رہ" شہ رسول اللہ کی ایک حدیث ہے۔ لوگو! تمہارے کچھ نقوش ہیں، یہاں
رہو اور ایک منزل ہے یہاں ٹھہر جاؤ، اللہ نے کچھ فرائض عائد کئے ہیں اسے ضائع نہ کرو۔ کچھ باتیں حرام کی ہیں انہیں بے حرمت نہ کرو۔ کچھ
سے رحم میں آکر خاموشی اختیار کر لی ہے؟ اللہ بھولا نہیں ہے اس لئے انہیں نہ پوچھو" زمانہ نزول وحی میں سوال سے روکا گیا ہے تاکہ لوگ مقید نہ ہو
ہا اور پھر اس وقت اور مابعد میں یہ بات ان پر لازم ہو جاتی۔ شریعت نے محض تخفیف کے پیش نظر خاموشی اختیار کی ہے اور ان کے احوال
تبدیلی کا لحاظ کیا ہے" وما کان ربک نسیا " تمہارا پروردگار بھولا نہیں ہے شریعت میں یہ فیاضی کچھ اس حد تک پہونچی ہے کہ آپ نے
یا ہے مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جو کوئی بات پوچھے اور محض پوچھنے پر وہ بات حرام کر دی گئی ہو۔
آیت سورہ شوریٰ کی ہے سورہ شوریٰ کا نام ہی شوریٰ کی اہمیت کے لئے کافی ہے شہ ہم اسلام پر عقیدہ اور نظام کی حیثیت سے
نگو کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ اسلامی انقلاب فرد کے ضمیر سے ابلتا ہے اور معاشرہ کی طرف بڑھتا ہے۔ جو بھی اجتماعی
معاشرتی یا سیاسی تنظیم اس کے لئے اٹھتی ہے اس کا مقصد اور بنیاد فرد کی تعمیر صالح ہوتی ہے جسے عقیدہ سزا سے پہلے قوت پہونچاتا ہے
کا وجود ہر نظام میں بنیادی ہے جو عقیدہ پر قائم ہوتا ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں سے کس طرح حساب لے گا اس کا
لعہ یہاں کافی ہوگا۔ ان کل من فی السموات والارض الا اٰتی الرحمٰن عبدا .... اتیہ یوم القیامۃ فردا"
ہ ان شرائط میں پڑنا ہم پسند نہیں کرتے کیونکہ عام ضابطوں سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کے ارکان میں
بقیہ نوٹ ص۳۹ پر

مجلس شوریٰ جسے امت منتخب کرتی ہے امام کی نگراں ہوتی ہے۔ وہ اس کے تنفیذی امور پر کڑی نگاہ رکھتی ہے اور امت کے عام مصالح کو حسب تقاضا ایسے تشریعی قوانین سے منضبط کرتی ہے جو کتاب و سنت سے متعارض نہ ہوں۔ اس کے فیصلے ارکان کی اکثریت سے صادر ہوں گے۔

(۳) شورائی بنیاد کے ساتھ امت کے مشورے اور بیعت سے اسلامی حکومت میں امراء منتخب ہوں گے۔

حاشیہ صفحہ ۳۸ کا بقیہ۔

رکنیت کے لئے وفاداری اور کوائف عالم سے باخبر ہونا ضروری ہے، فقہ میں "اہل حل و عقد" کی اصطلاح اس کی دلیل ہے یہاں کچھ دوسرے خیالات بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ منتخب ارکان میں، تقویٰ، دینی معرفت اور عالمی امور سے واقفیت ہونی چاہئے نیز ایک سپریم کورٹ مجلس شوریٰ کا انتخاب کرے۔ یہ سپریم کورٹ تمام شرعی اختلافات کا قطعی فیصلہ کرے گی اور کتاب و سنت سے متصادم ہر قانون کو رد کر دے گی۔ ہم یہاں رائے دہندوں اور امیدواروں میں صرف ایک شرط دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ دونوں میں پاکیزگی اور تقویٰ کی صفت پائی جائے جس کا ادنیٰ ترین معیار یہ ہے کہ وہ کھلی ہوئی معصیت میں مبتلا نہ ہوں اور نہ علانیہ اعتبار سے بے کردار ہوں۔ رائے دہندوں کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان کا ووٹ دراصل ایک طرح کی گواہی ہے جو مال و دولت کے سلسلہ میں گواہی سے زیادہ عام اور اہم ہے۔ قرآن کہتا ہے "اگر کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرو۔" اور جہاں تک مجلس شوریٰ کی رکنیت کا سوال ہے تو اس رکنیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلامی پیغام کا امین ہوگا، جس پیغام سے متعلق نہایت مختصر جملہ میں آنحضور نے فرمایا ہے۔ "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔"

سلہ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اپنے مضمون "الدین والدولۃ فی الاسلام" میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:-

"اسلام جب حکومت کے بعض اعمال کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص کرتا ہے مثلاً حکومت کا اعلیٰ ترین عہدہ تو اس لئے کہ اسلام اپنے اصولوں اور فلسفہ میں ایک نظام ہوتا ہے اور حکومت کا سربراہ اس نظام کا نگراں اور اس کی تنفیذ کا ذمہ دار ہوتا ہے پھر یہ نگرانی کیونکر ان لوگوں کو سونپی جا سکتی ہے جو حکومت کے نظام اور قوانین پر ایمان نہیں رکھتے۔ اسلام کا موقف یہاں وہی اشتراکیت حکومت کی سربراہی کے سلسلہ میں اختیار کرتی ہے۔ جہاں غیر کمیونسٹوں کو حکومت کی سربراہی کا حق نہیں دیا جاتا۔ حکومت کے چھوٹے پارٹی کے عہدے بھی انہی کمیونسٹوں کو رکھا جاتا ہے جو اشتراکی نظام پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح کا موقف کمیونسٹوں کے مقابلہ میں سرمایہ دار اختیار کرتے ہیں، جو کسی کمیونسٹ کو اپنی مملکت کا سربراہ منتخب نہیں کرتے بلکہ یہ تو کمیونسٹوں کے لئے عام وظائف میں بھی کوئی حصہ نہیں دیتے انہیں بھگاتے ہیں اور ان کے لئے عدالتیں قائم کرتے ہیں، قید خانوں میں بند کر دیتے ہیں اور ان پر انواع و اقسام کے ظلم و ستم کی مشق کرتے ہیں اسلام اس حد تک نہیں پہونچتا بلکہ وہ اس کی اجازت بھی نہیں دیتا یہاں جو تاریخ اسلامی کے مختلف عہدوں میں یہود و نصاریٰ مال، رفاہ اور صحت کے محکموں میں وزیر رکھے گئے ہیں۔ لاطینی حکومت ہائے امریکہ کے مقابلہ میں اسلام کا موقف حق سے زیادہ قریب تر ہے، لاطینی امریکہ میں ایک کیتھولک اور شمالی حکومتوں میں ایک پروٹسٹنٹ ہی حکومت کا سربراہ بنایا جا سکتا

(بقیہ صفحہ ۴۰ پر)

اور جب امام کا انتخاب مکمل ہو جائے تو امت پر اس کی بیعت واجب ہو جاتی ہے اور ممکن ہے اس سلسلہ میں نمائندہ مجلس
کی بیعت ہی کافی ہو سکے۔ اس بیعت کی بنیاد آنحضورؐ کا وہ قول ہے جو عبداللہ بن عمر کے بیان سے مسلم نے نقل کیا ہے "جو کوئی م
اس کی گردن میں کوئی بیعت نہ ہو تو جاہلیت کی موت مرا" بیعت ایک طرح کا عہد ہے جو امام کے ساتھ تشریعی امور کی تنفیذ، نیا
و انصاف اور امت کے عام مصالح اور امور کی نگرانی کے لئے باندھا جاتا ہے۔ یہ امت کا عہد ہے کہ وہ معصیت الٰہی کے علاو
بات میں سمع و طاعت کا مظاہرہ کرے گی۔ اس کی بنیاد آنحضورؐ کا وہ قول ہے جس کے راوی شیخین ہیں "مسلمان شخص پر سمع و طاعا
ہے، خواہ پسند ہو یا ناپسند ہو، البتہ جب معصیت کا حکم دیا جائے تو سمع و طاعت نہیں ہے"

امام خدا کے آگے اور امت[^] کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ اس کی مسئولیت اصل شوریٰ کی ایک فرع ہے جیسا کہ ہم تذکرہ کر چکے
اس سلسلے میں آنحضورؐ کا قول ہے "ہر شخص راعی ہے، اور اپنی رعیت کا جوابدہ ہے۔ امام راعی ہے اور اپنی رعیت کا جوابدہ ہے" (
اس کی مسئولیت مجلس شوریٰ کے سامنے اس کے عام تصرفات اور تنفیذ امور[^] سے متعلق ہوگی جس کے لئے وہ امت کی سربراہی کے لئے منتخب کرتی ہے۔ اس سلسلے میں آنحضورؐ کا قول ہے "جو کسی جماعت کا آدمی کسی عہدے کے لئے منتخب کرے اور اس سے
بہتر شخص ہو جو اس سے اللہ کی نظر میں مقبول ہو تو اس نے اللہ، رسول اور مسلمانوں کے حق میں خیانت کی" (حاکم) باقی رہے اما
شخصی حالات اور اس سلسلہ میں اس کے حقوق و اختیارات تو وہ امت کے باقی تمام افراد کے مثل ہونگے ان سے وہ ممتاز نہ ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۹)

ہے اور آج تک حکومتہائے متحدہ امریکہ کے منصب صدارت پر سوائے پروٹسٹنٹوں کے اور کوئی نہیں آیا باوجودیکہ کیتھولک اور پرو
عیسائی مذہب کے دو فرقے ہیں۔

[^] فقہاء نے بہت سی شرطیں امام کے اندر رکھی ہیں زیادہ تر یہ شرطیں اجتہادی ہیں جس میں عام مصلحت اور امام کی اہم ترین
ذمہ داری کا اعتبار کیا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ اکثر شرطیں اجتہادی علم میں افضلیت، عزم و احتیاط، عدل اور وسیع
النظری کی ہیں جو امام کے لئے اس کی اہم ترین ذمہ داریوں کے سنبھالنے میں معاون ہوتی ہیں، یہ ذمہ داریاں ایک ایسے پیغام سے
ہوتی ہیں جو کچھ مقررہ احکام، ایک خاص فلسفہ اور وسیع زمین کا حامل ہوتا ہے چہ جائیکہ ان میں سے بعض باتیں وہ ہیں جو ہر جگہ
میں سیاست و تدبر کی محتاج ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ ہمیں نظر آتا ہے کہ ان صفات کے اندر افضلیت کے لئے مرجح ہر جگہ اور زمانہ میں امت
بیدار مغزی کا رہی ہے وہ اپنے مصالح اور حالات کے مطابق ایک موقف اختیار کرتی رہی ہے اس سلسلہ میں قاضی ابو یعلیٰ کا قول
تعجب خیز ثابت ہوا جو انہوں نے امامت کے امیدواروں کے مقابلہ میں امت کے موقف کے سلسلہ میں پیش کیا ہے "اگر ایک زیادہ عا
ہو اور دوسرا زیادہ بہادر تو اسے سمجھنا پڑے گا۔ اگر ضرورت بہادری کی ہو مثلاً سرحدی انتشار اور بغاوت وغیرہ کی مشکل درپیش ہو
اس بہادر کو حق دیا جائے گا اور اگر ضرورت اعلم (زیادہ علم والے) کی ہو، مثلاً فضا میں سکون ہو اور اہل بدعت و اہوا کا غلبہ ہو
تو اعلم زیادہ حقدار ہوگا" وہ شرائط جن کی تعیین کا اختیار امت کو حاصل ہے وہی شرائط ہیں جو کتاب و سنت میں صراحت کے سا
موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ امام مسلمان ہو "واولی الامر منکم" مرد ہو، "لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ" (احمد، بخاری،
ترمذی) راشد ہو، "نعوذ باللہ من امارۃ الصبیان" ابوداؤد ابی ہریرہ، صحیح السیرت ہو، کیونکہ وہ امت کی سربراہی اس راہ پر
کا جسے آنحضورؐ نے متعین فرمایا ہے "انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" اور اس کا ادنیٰ ترین معیار وہی ہے جس کا ہم نے مجلس شو
کے امیدواروں کے بالمقابل تذکرہ کیا ہے۔

(نمبر ، نمبر کا حاشیہ ص ۴۱ پر)
(نمبر حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خلفائے راشدین نے خلافت کے شروع میں یہ نہج اختیار کیا اور امت کو دعوت دی کہ ان کا محاسبہ کرے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کی ابتدا میں فرمایا "اگر مجھے حق پر پانا تو میری مدد کرنا اور اگر باطل پر دیکھنا تو مجھے درست کردینا" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "جو کوئی میرے اندر کوئی کجی پائے تو اسے ٹھیک کردے" (رضی اللہ عنہما)

بلکہ آنحضورؐ تو اس بنیاد کی عدم موجودگی کو ساری امت کے لئے خطرہ تصور فرماتے تھے۔ چنانچہ صراحت کے ساتھ آپ کا قول موجود ہے "جب دیکھو کہ میری امت کسی ظالم کو ظالم کہنے سے ڈرتی ہے تو ایسی امت کو الوداع کہ دو" زمین کا شکم اس کے لئے اس کی پشت سے بہتر ہوگا۔

اسلام اس طرح ہر اس نظام سے بری ہے جو اس بنیاد کے علاوہ کسی اور بنیاد پر استوار ہوتا ہو۔

ہمارے پیش نظر کتاب وسنت کے جو نصوص موجود ہیں ان میں امت کو کہیں اس بات سے روکا نہیں گیا ہے کہ وہ اپنا حاکم ایک متعین مدت کے لئے منتخب کرے یا اسے معزول کردے۔ یہ دونوں باتیں امت کی رائے پر موقوف ہیں، مصلحتوں کا جیسا تقاضا ہوگا اس کے مطابق وہ ہر زمانہ میں کوئی راہ متعین کرے گی۔ مقصد صرف یہ ہوگا کہ بہر حال ہر اختلاف کے موقع پر عدل وانصاف کی راہ معلوم کرنے کے لئے شریعت ہی مرجع ہے۔

۳۔ عدالتی نظام:- ایک مستقل اور آزاد نظام ہے اور صرف کتاب وسنت اور مجلس شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہے۔ اس کے سامنے ملک اسلامی کے تمام باشندے حاکم ہوں یا محکوم سب برابر ہونگے۔ خواہ کوئی دعویٰ ہو یا کارروائی، یا احکام کی تطبیق کا مسئلہ یا عدالت وانصاف کا فیصلہ یا تنقید کا معاملہ۔ اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ مطلق قول "واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل" اور آنحضورؐ کا وہ قول ہے جو آپ نے اسامہؓ سے اس وقت فرمایا تھا جب وہ چور مخزومی عورت پر قائم کی جانے والی حد کے سلسلہ میں سفارش لے کر آئے تھے۔ "کیا تم حدود الٰہی میں سے کسی حد سے متعلق کوئی سفارش کرتے ہو" پھر کھڑے ہو کر تقریر فرمائی "لوگو! پہلے لوگ گمراہ اس لئے ہوئے کہ جب کوئی شریف چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے اور قسم خدا کی اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ چوری کرے تو محمد اس کا ہاتھ کاٹ دیں گے" (متفق علیہ)

(بقیہ حاشیہ ص۴۱)

۳؎ ہمارا خیال ہے کہ آزادانہ بیعت زیادہ اولیٰ ہے خواہ یہ براہ راست امام کے لئے ہو، یا امامت کے لئے یا امامت کے انتخاب کے لئے کسی مجلس نمائندگان کے لئے ہو کیونکہ یہاں ہر فرد کو یہ شعور دیا جاسکے گا کہ وہ کون سی بنیاد ہے جس پر نظام حکومت قائم کیا گیا اور وہ کون سا قاعدہ ہے جس کے مطابق حاکم و محکوم کے رشتے ہوں گے۔ ۴؎ رسالہ "مشکلاتنا فی ضوء النظام الاسلامی" میں "نظریۂ حکومت اسلامی کے موقع پر استاذ امام حسن البناء شہید فرماتے ہیں:-

"حاکم اللہ کے سامنے اور لوگوں کے سامنے جوابدہ ہے وہ ان کا مزدور ہے اور عہدیدار ہے۔ رسول اللہ فرماتے ہیں "ہر شخص راعی ہے اور اپنی رعیت کا جوابدہ ہے" جس وقت منصب خلافت پر ابوبکرؓ تشریف لائے تو فرمایا تھا "لوگو! میں اپنے عیال کے لئے پیشہ کرتا تھا اسی کی روزی حاصل کرتا تھا اب تم سب کے لئے پیشہ کروں گا تو میرے لئے بیت المال سے کچھ مقرر کرو" اس طرح آپ نے اجتماعی معاملت کی عمدہ ترین اور مبنی بر انصاف تفسیر پیش کی ہے بلکہ اس کی بنا رکھ دی ہے اس لئے۔ رعایا اور حاکم کے درمیان ایک طرح کی معاملت ہے جو عام مصالح کی رعایت کے لئے کی جاتی ہے اگر معاملت عمدہ رہی تو اس کا بدلہ ملے گا اور خراب ہوگی تو سزا کا مستحق ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ ص۴۰) ماوردی یا ابویعلی کی کتاب الاحکام السلطانیہ میں ولایات کی فصل کا مطالعہ کیجئے جس میں امام کو حق دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو وزارگ منتخب کرے اور دو طرح کی وزارت بنائے۔ وزارت تفویضی اور وزارت تنفیذی۔ فرق یہ روایت ہے کہ دوسری قسم کی وزارت کا عہدہ کسی ذمی کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔

۴ - انسانی جان کی حرمت :- زندگی میں اس پر کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے گی۔ مال و دولت، عزت، عقیدہ و مسلک اور امن و سلامتی سب اس کی محفوظ ہوگی۔ خواہ اسلامی مملکت کا اصلی باشندہ ہو یا خارج سے آکر آباد ہوگیا ہو، مسلمان ہو یا غیر مسلم، بھوکے کو کھانا کھلایا جائے، ننگے کو کپڑا پہنایا جائے، بے پناہ کو پناہ دی جائے، مریض کا علاج کیا جائے، خواہ وہ دشمن ہی تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس سلسلہ میں دین، زبان، قومیت، وطنیت، رنگ، نسل یا پیشہ کا کوئی امتیاز ملحوظ نہ ہوگا۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنی قیمت خود گرا دے اور حکومت کے خلاف کسی سازش یا اسی طرح کے دیگر دل چسپیوں مثلاً جاسوسی وغیرہ میں مبتلا ہو تو حسب قانون اسے سزا ملے گی۔ یہاں بھی عدل و انصاف ملحوظ ہوگا۔ کسی جذباتی جوشیلے یا صوبائی یا قومی عصبیت کا دخل مطلقاً نہ ہوگا اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ "تمہیں کسی قوم کی دشمنی ناانصافی کا مجرم نہ بنا دے، انصاف کرو کہ تقویٰ سے قریب تر یہی بات ہے"

نفس انسانی کا ذاتی احترام اس عدل کا تقاضا ہے جس کے تمام لوگ منجانب اللہ پابند ہیں۔ یہی وہ مفہوم ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس جیسے قول کا ہوا کرتا۔ "ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق" ایسا ہی قول آنحضورؐ کا ہے "مسلمان وہ ہے جس سے لوگ اپنے مال اور جان کے سلسلہ میں محفوظ ہوں"

تقریر و تحریر کی آزادی، عبادت و اجتماع، انتخاب پیشہ اور ادھر ادھر آنے جانے کی آزادی کی مکمل حمایت حاصل ہوگی جو تمام باشندگان ملک کے لئے یکساں ہوگی۔ اور یہی تقاضا بھی ہے ہر فرد کی اس مسئولیت کا جو اللہ کے سامنے اپنے تئیں وہ مکمل طور پر رکھتا ہے۔ "کل نفس بما کسبت رھینۃ" اور جائز نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی قید رکھی جائے ہاں اگر اس کا حق دوسرے حقوق پر حملہ آور ہوتا ہو دوسروں کے حقوق کی حرمت ٹوٹتی ہو یا امت کے عام مصالح خطرے میں آتے ہوں تو وہ ان کے مطابق سزا کا مستحق ہوگا۔ ہر قید جسے حاکم لوگوں پر ظالمانہ طور پر لاگو کرے گا تو وہ عوامی زندگی کو شریعت کی حدود سے دور لے جانے کا مجرم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "ولقد کرمنا بنی آدم"

۵ - ذمی رعایا :- وہ غیر مسلم حضرات ہیں جو اسلامی مملکت میں آباد ہوتے ہیں۔ ان کا مسلمانوں کے ساتھ رابطہ ایک عہد کے ذریعہ قائم ہوگا جو مقدس اور واجب المراعات ہوتا ہے۔ عام حقوق تمدنی قوانین اور جرم و سزا کے احکام کے اندر وہ تمام مسلمانوں کے مساوی ہوتے ہیں۔ اُن کے عقیدہ و مسلک اور شعائر کے احترام و قیام کا پورا لحاظ کیا جائے گا۔ شخصی حالات کے اندر انہیں آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلے کریں۔ ہاں اگر وہ رضامند ہوں کہ وہ اس سلسلہ میں اسلامی فیصلہ کے پابند ہوں گے تو مسلمانوں کے مانند ان کے امور کا بھی تصفیہ کیا جائے گا۔ ان کا حق ہے وہ اپنی مخصوص تہذیبوں کی حفاظت کریں، اور ان کے مطابق اپنی نسلوں کی پرورش کریں۔ اسلام نے انہیں زکوٰۃ کے ٹیکس سے معاف رکھا ہے۔ ہاں اگر وہ خود اپنی رضا سے اس خدمت کو انجام دینا چاہیں اور وطنی دفاع و امن کے اخراجات میں ان کی شرکت ضروری بھی قرار دی جاچکی ہو تو اور بات ہے لیکن ان اخراجات سے عورتیں، بچے، بوڑھے، عبادت کے لئے مخصوص ہو جانے والے اشخاص اور فوج میں جانے والوں کو معاف رکھا گیا ہے۔

اہل ذمہ کے حقوق کسی فرد سے اسی وقت زائل ہوں گے جبکہ اس کے خروج کا اعلان کردیا گیا ہو یا اس کی کھلی ہوئی بغاوت اور ظلم کا اظہار ہوچکا ہو اس سلسلہ میں عدالت کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

اب اس کے بعد یہ حقیقت ہے کہ اسلام ہر اس الزام سے بری ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے نظام حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ ناروا برتاؤ کیا جاتا ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ انسانیت مخالفوں کے ساتھ اسلامی حکومت

ہے زیادہ مبنی بر عدل و انصاف کسی اور حکومت کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ خواہ نظریاتی امور کا معاملہ ہو یا عملی تنفیذ کا مسئلہ، اور اگر کوئی زمانہ ایسا گزرا ہے جہاں ظلم و تشدد کا منظر سامنے آیا ہو تو وہاں مسلمان اور غیر مسلم دونوں یکساں طور پر شکار ہوئے ہیں۔ اور غیر مسلم حضرات پر آفتیں بہت کم آئی ہیں اور تاریخ میں اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی صحیح ہو تو یہ ظالم حکمراں کی غلطی تھی۔ اسلام اس سے بالکل بری ہے۔

(ب) خارجہ سیاست

(۱) اسلام نے تمام عالمی قوموں کے مابین رابطہ انسانی کی وحدت کا اعلان کیا ہے۔ زمین کے کسی گوشہ میں بھی انسان رہے انسان ہی ہے۔ قرآن صراحت کے ساتھ اسے اس وقت پیش کرتا ہے جب کہ وہ تمام لوگوں کو مخاطب کرتا ہے" یا ایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً ونساءً"

انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ لوگ باہم قریب ہوں اور تعارف حاصل کریں۔ دور نہ ہوں اور نہ باہم جھگڑا کریں اس بات کو قرآن صاف انداز میں پیش کرتا ہے "یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ان اللہ علیم خبیر"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان اپنے عقیدہ سے اس گہرے جذبۂ انسانی کی پیداوار ہے" اس کا ایمان ہے کہ جغرافی حدود، سیٰ تقسیمیں، شکلوں، قومیتوں اور زبانوں کا اختلاف انسان اور انسان کے مابین حائل نہیں ہوسکتا۔

اس عام رابطہ کی اصلیت کی دلیل یہ ہے کہ اسلام نے جب عدل و انصاف فرض کیا ہے تو کسی ایک شخص کو مخصوص نہیں کیا ہے۔ اور نہ کسی ایک قوم کا لحاظ کیا ہے حق بہر حال حق ہے خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، عدل تمام لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ دیکھئے کہ جبریل کس طرح طعمہ بن ابیرق یہودی کو بری کرنے اور مسلمان کو ملزم قرار دینے کے لئے آسمان سے اترتے ہیں سورہ نساء کے اندر اس سلسلہ کی ۱۹ آیتیں موجود ہیں۔ بنا بریں اسلامی حکومت اپنے علاوہ دوسری حکومتوں کے ساتھ تنہا یا جھگڑا کر کے زندہ نہیں رہے گی بلکہ اس کے ساتھ تعارف و مصالح کا تبادلہ کرے گی۔ نہ ظلم کرے گی اور نہ ظلم قبول کرے گی۔

۲۔ اس عام انسانی رابطہ کے پہلو بہ پہلو یہ بات منافی نہیں ہے کہ اسلام امت اسلامیہ کی وحدت کو ثابت رکھے مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے "انما المؤمنون اخوۃ" اس وحدت کا مطلب مسلمانوں کے درمیان قومی عصبیت نہیں بلکہ ایمان و نظریہ کی وحدت ہے جو بنی نوع انسان کے اندر ایک ساتھ جمع ہو جاتی ہے انہیں حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ایمان کے مطابق زندگی بسر کریں ایمان کا فرض ہے کہ انسانی زندگی کی خدمت میں اس قدر حصہ لیں جتنا کہ ان کا ایمان خیر اور بھلائی تصور کرتا ہو۔ بغیر کسی جبر یا زبردستی کے۔ "لا اکراہ فی الدین" اور "ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین" پھر یہ کوئی مقفل اور بند وحدت نہیں ہے جس کا دروازہ کھلا ہوا نہ ہو بلکہ اس کی راہ ہر اس شخص کے لئے کھلی ہوتی ہے جس کا سینہ اسلامی پیغام کو قبول کرے اور محض اپنی پسند اور ارادہ سے اسے اپنی زندگی کی شاہراہ بنائے۔ اس وحدت کے لوگ عیسیٰ، موسیٰ اور محمد اور ان کے دیگر بھائیوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ "کل امن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ، لا نفرق بین احد من رسلہ" (صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم) پس یہ ایک ایسی وحدت ہے جس کے اندر باہمی اتحاد اور دیگر آسمانی مذاہب کی قدر و منزلت کا عنصر ملتا ہے۔

غالباً دنیا جب کہ وطنی، قومی اور گروہی عصبیات کا تلخ تجربہ کر چکی ہے اور ہر حکومتی پیمانہ پر پیدا ہونے والی مشکل میں تمام راہیں بس پر گم ہو چکی ہیں۔ ایک نئے طرز کے رابطہ کی ضرورت کا احساس کر رہی ہے جہاں تمام عوامل سے بلند تر ہو اور صرف حق

کی حمایت کرتا ہو، خواہ وہ کہیں اور کسی کے بھی ساتھ کیوں نہ ہو۔ مسلمان ذمہ دار ہیں کہ اس راہ میں اپنا پارٹ ادا کریں اور مصلحتوں اور خواہشات کی عصبیتوں سے اپنے آپ کو پاک کرلیں۔ اور جان لیں کہ یہ اللہ کی امانت ہے جو ان کی گردنوں میں ڈالی گئی ہے۔ "کذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس"

اس شیرازہ بندی کے لئے ہم کوئی خاص شکل متعین نہیں کرتے اور نہ کسی کا حق تصور کرتے ہیں کہ اس کی تحدید کرے، اسے امت اسلامیہ کے شرعی نمائندوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب امت ہر جگہ اپنی آزادی حاصل کرے اور اسے پورا پورا اختیار حاصل ہو جائے کہ انہی لوگوں کو منتخب کرے جو اس کے عقیدہ ومسلک کے سچے نمائندہ ہوں۔ اس سے پیشتر کوئی کاوش ایک بلبلہ کی مانند ثابت ہوگی جو جلدی ٹوٹ جائے گا یا پھر وہ قومی عصبیت ہوگی جو اسلام کی نمائندہ نہ ہوگی۔ یا پھر وہ مسلمانوں کے لئے ایک نیا دھوکا ثابت ہوگی۔

۳۔ عام رابطہ انسانی اور وحدت اسلامی کے پہلو بہ پہلو یہ منافی نہ ہوگا کہ ہر اہل وطن اپنی وطنیت اور ہر قوم اپنی قومیت کو پکڑے رہے، جب کہ یہ گرفت وطن یا قوم کے لئے شریفانہ وفا اور خیر سے وابستگی اور ان امور کو انسانیت اور بھلائی کیلئے مسخر کرنے کا مفہوم رکھتی ہو۔ نہ یہ کہ وطنیت یا قومیت کی حدود خیر وشر اور حق وباطل کی حدود قرار پا جائیں۔ اسی بنیاد پر اور اسی اسپرٹ کے مطابق عرب اپنی عربیت[1] پر قائم ہیں اور عربی وحدت کا نعرہ لگا رہے ہیں۔

۴۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اسلامی حکومت کے غیر دوست ممالک سے تعلق کی اساس صرف یہ ہے کہ عدل وانصاف کے ساتھ باہمی تعارف اور مصلحتوں کا تبادلہ ہو۔ اس لئے ہر دشمن طاقت سے اس کا تعلق محض اس لئے ہوگا کہ ظلم کو دفع کیا جائے، اگر مصالحانہ طریقہ اس سلسلہ میں کام دیتا ہے تو بہتر "وان جنحوا للسلم فاجنح لہا" اور اگر یہ طریقہ کام نہ دے رہا ہو تو جنگ واجب ہوگی۔ "فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم" پھر اس وقت اسے اس وقت تک صلح کی اجازت نہ ہوگی جب تک ظلم نیست ونابود نہ ہو جائے" وقاتلوہم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ۔ فان انتہوا فلا عدوان الا علی الظالمین" یہ جیسا کہ نظر آتا ہے حق کو قائم کرنے اور ظلم کو دفع کرنے کی راہ میں ایک جنگ ہے، یہاں حرص وآز اور اقتدار پسندی کا کوئی سوال نہیں، اسی لئے اسے جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔

جس طرح صلح کے کچھ اخلاقی قوانین ہیں اسی طرح جنگ کے اخلاقی ضابطے بھی ہیں اس سلسلہ میں خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کی اس وصیت کا تذکرہ کر دینا کافی ہے جو آپ نے پہلے اسلامی لشکر کو کی تھی۔ یہ لشکر جزیرۃ العرب سے نکل کر رومیوں کی سرکوبی کے لئے نکلا تھا۔" مثلہ نہ بنانا، کسی ننھے بچے، بوڑھے اور عورت کو قتل نہ کرنا، کھجوروں کے باغ کو کاٹنا یا جلانا نہیں، پھلدار درخت کو کاٹنا نہیں، کوئی بکری یا اونٹ ذبح نہ کرنا، ہاں اگر کھانا ہو تو الگ بات ہے تم کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے گذرو گے جنہوں نے اپنے آپ کو صوامع (راہبوں کے معابد) میں محبوس کرلیا ہے، ان کو چھوڑ دینا کہ یہ عبادت میں مشغول رہیں" اس وصیت کے اندر آپ کو اسلام کی وہ اسپرٹ ملے گی جو ظلم وزیادتی، تخریب کاری اور خونریزی سے نفرت کرتی ہے اور عدل وانصاف ورحمت اور محترم اشیاء کی مراعات کے لئے فضا ہموار کرتی ہے۔ جب مسلمان دشمنوں سے کوئی عہد کر لیتے ہیں تو وہ اس عہد کے وفادار رہیں گے، خواہ کچھ بھی ہو" واوفوا بعہد اللہ اذا عاہدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدہا،

---

[1] "عربی قومیت" کا نعرہ اب خالص جاہلی نعرہ بن گیا ہے، اسلام اس قسم کی قومیت اور وطنیت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ (م۔ق)

وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا ، ان اللہ یعلم ما تفعلون " صلح حدیبیہ کے بعد جب ابو جندل مکہ سے بھاگ
کر آپ کی خدمت میں پہونچے تو فرمایا " ہمارے مذہب میں غداری جائز نہیں ہے "

اگر مسلمانوں کو کسی ایسی قوم سے خیانت اور غداری کا خطرہ ہو جس سے ان کا معاہدہ ہے تو ان کے لئے جائز نہیں ہے
انہیں متنبہ کئے بغیر اچانک ان پر ٹوٹ پڑیں ۔ " واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سواء ان اللہ
لا یحب الخائنین " اسی طرح ان کے لئے جائز نہیں ہے کہ زمانہ معاہدہ میں کسی طرح کے ظلم کی پالیسی بنائیں اور اچانک حملہ
کر بیٹھیں ۔ اس سے قبل امیر معاویہ اور شاہ روم کے مابین ایک معاہدہ تھا ، لیکن معاویہؓ نے چاہا کہ ان کی سرحد کے قریب پہونچیں اور
معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی روم پر حملہ کر دیں لیکن اس موقعہ پر عمروؓ بن عتبہ فوراً سامنے آئے اور فرمایا اللہ اکبر ، اللہ اکبر ،
معاویہؓ ! غداری نہیں وفاداری کرو ، میں نے آنحضورؐ کو فرماتے سنا ہے کہ " اگر کسی شخص ـــــــ اور کسی قوم کے مابین کوئی معاہدہ ہو
تو مدت کے خاتمہ سے پہلے نہ گرہ کھولی جائے نہ باندھی جائے ، ہاں مدت ختم ہو جائے تو یہ معاہدہ توڑ دیا جائے " اس بات پر معاویہؓ
واپس آگئے ۔

جس عہد کو مسلمانوں نے اس انداز میں نباہا وہ عہد ہے جو رضامندی اور خوشی کے ساتھ باندھا گیا ہے زبردستی ان پر لادا
گیا ہو ۔ اس لئے کہ زبردستی جو عہد لیا گیا ہو وہ عہد نہیں اور نہ اس کا کوئی احترام ہو گا ۔

ظلم کو دفع کرنے اور امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی حکومت ایسی طاقت در ہو جسے
کوئی لالچی یا غدار لقمہ تر نہ بنا سکے ۔ " واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ
وعدوکم وآخرین من دونھم لا تعلمونھم ، اللہ یعلمھم "

۵ ۔ پچھلے چار ضابطوں کی روشنی میں یہ بات طے ہے کہ تمام عالم اسلامی کے اندر استقلال و حریت اور اسلامی ملکوں کو آزاد
کرانے کے مسائل جن میں سب سے بڑا مسئلہ فلسطین کا ہے یہ سب کا سب ایک ہی مسئلہ ہے یعنی اس ظلم کا مسئلہ ہے جسے اسلام
منظور نہیں کرتا اسی طرح یہ اسلام کا تقاضہ ہے جو مسلمانوں پر فرض کرتا ہے کہ وہ اپنے مظلوم بھائی سے غافل نہ رہے ۔ رسول اللہ
فرماتے ہیں " مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ظلم کے لئے اسے چھوڑ دیتا ہے "

مسلمان ذمہ دار ہیں کہ اس ظلم کو رفع کرنے میں باہم تعاون کریں اور سمجھ لیں اس کی راہ صرف تنظیم و مقابلہ ہے ، وسیلہ
زنی یا نفع اندوزی میں ہے ۔

بڑی طاقتیں جو اس ظلم کی مشق کر رہی ہیں یا اس کے لئے مدد پہونچا رہی ہیں ان سے مطالبہ ہو گا کہ وہ مسلمانوں سے اپنا ہاتھ اٹھا
لیں اور انہیں بتا دینا ہو گا کہ قوموں کو دباؤ ۔ میں لینے اور اسلام کو در بدر کرنے کا زمانہ رخصت ہوا ۔ اُن کی سازشوں اور آلۂ
اجال تاریخ کو بدل نہیں سکتا ۔ قوموں کو آزاد کئے بغیر چارہ نہیں ، خون جو بہائے گئے ہیں وہ رائگاں نہ جائیں گے ، اور وہ حق جو
خوشی نہیں دیا جاتا زبردستی سے لیا جائے گا ۔

ہمیں اپنے حقوق پر پورا ایمان ہے جو شکست کھانا جانتا ہی نہیں ، ہم ہر دشوار گھاٹی عبور کرنے کے لئے تیار ہیں
اللہ تعالیٰ کی مدد پر پورا اعتماد ہے ، ہر آن ما لک اللہ کا یہ قول دہراتے ہیں " الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا
لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل فانقلبوا بنعمۃ من اللہ وفضل لم یمسسھم
سوء واتبعوا رضوان اللہ واللہ ذو الفضل عظیم "

اقتصادی پہلو

اسلام کا اقتصادی نظام دو نمایاں خوبیوں سے ممتاز ہوتا ہے

۱۔ یہاں اقتصادی دلچسپیوں کا معاملہ ان اصولوں سے الگ نہیں ہے جسے اسلام نے لوگوں کے لئے مقرر کئے ہیں کیونکہ ان زندگی معنوی اقتصادی دونوں امور کا ایک کامل ترین مجموعہ ہے اگر یہ اصول زندگی کی مادی ضرورتوں کی پوری ضمانت نہیں دیتے تو ان امور اور واقعاتی دنیا کے درمیان ایک بڑا گڑھا حائل ہو جائے گا جس سے کوئی جائے فرار نہ ملے گی یہی وہ بات ہے جس میں دیگر نظام مبتلا ہوگ کیونکہ انہوں نے اپنے اقتصادی نظام کی بنیاد "اقتصادی انسان" پر رکھی جس کا کوئی کام یا جس کی کوئی دلچسپی، خودغرضی، خودپسندی، نفع اندوزی خالی نہیں ہوا کرتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس نے اجتماعی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کو "علم معاشیت" کا نام "کالاعلم" رکھنے پر مجبور کر دیا۔

اسلامی اقتصادیات کے اندر معنوی اور مادی امتزاجات جدید تحقیقات کے لئے کچھ اجنبی نہیں ہیں جو اقتصادی نفسیاتی اسکول کلاسیکل اور مادی اسکول کے پہلو میں رکھتی ہیں۔ بلکہ اکثر معاشی ناہمواریوں کا علاج جسے نئے ماہرین اقتصادیات پیش کرتے ہیں افراد یا جماعتوں کی نفسیاتی تاثیرات پر ہی تعبیر بھی کرتے ہیں اور یہ تاثیرات معنوی امور کا حکم رکھتے ہیں جن کے لئے مادی دنیا کے اندر کوئی پیمانہ ہے مگر ان تاثیرات کو عالم مادہ سے الگ بھی نہیں جا سکتا۔ اس کا اثر عرض وطلب، مشکلات اصناف کی پیدائش مزدور کے لئے پیداوار صلاحیت، سکوں کی گردش کی سرعت، اور مسائل (ENTREPRENEUR) کے خطروں میں گھرنے میں بالکل طے شدہ ہے اس طرح نفسیاتی عامل کے اثرات ہم پیداوار، تقسیم، مبادلات وغیرہ میں دیکھتے ہیں یہ سرچور معیشت کے عناصر ہیں۔

(وقد اصبح اثرها مقرراً فی منحنی العرض والطلب وفی حدوث الازمات الدوریة وفی الکفایة الانتاجیة للعامل وفی سرعة تداول النقود وفی مدی فی مخاطرة المکافل (ENTREPRENEUR) وهکذا نری اثر العامل النفسی فی الانتاج والتوزیع والتداول والمخاطرة، وهی عناصر الاقتصاد الحدیث)

۲۔ اسلام اگرچہ مادی نظریات پر صاف انداز میں کڑی نگاہ رکھتا ہے مگر زیادہ تر وہ عام دائرے کھینچ دیتا ہے دولت کی پیداوار، اس کی نقل وحرکت اور تقسیم کی بحثوں میں نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ باتیں ہر زمانہ میں بدلتی رہتی ہیں اور جس طرح علوم و معارف اور وسائل زندگی میں ترقی ہوتی جاتی ہے ان میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ معاملات کو انسانی فکر اور اجتہاد[1] کے حوالہ کرتا ہے کہ وہ اس کے عام قانون کے تحت اپنے کام کی باتوں کے لئے کوئی صحیح اور صائب راہ اختیار کرے۔

مذکورہ بالا دونوں امتیازی خوبیوں کے اثرات ہم ان عام ضابطوں میں صاف دیکھ سکتے ہیں جس پر اسلامی معاشیات کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

فیاضی کی ایک ایسی بلند ترین مثال ہے جس کی جانب آج اکثر ملکوں میں انسانیت کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ یہاں یہ تذکرہ کافی ہے کیونسٹ ممالک میں ان لوگوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے جو تاریخ کی مادی تعبیر کے قائل نہ ہوں اور نہ ان لوگوں کے لئے یہاں کسی قسم کی جگہ نہیں ہے جو کارل مارکس اور لینن کو ملحد و بے دین خیال کرتے ہوں۔

---

[1] اور یہ اجتہاد دین وشریعت کے اصولوں کے حدود کو قائم رکھنے والا ہو، توڑنے والا نہ ہو۔ (م - ق م)

اسی طرح اسلام کی نمود قومی تعصب کے لئے ایک چیلنج تھی۔ اسلام نے وحدت انسانیت اور معیار انسانی کی یکسانی و یک رنگی کا اعلان کیا اور اس طرح اعلان کیا کہ قومیت کے طاغوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ اشرفیت کا صرف ایک ہی پیمانہ رکھا، نہ رنگ نہ وطن، نہ وراثت نہ نسب، بلکہ اللہ کا تقویٰ اور عمل صالح جو صرف شخصی امور ہیں، ان کا رنگ اور قومیت سے کوئی تعلق نہیں

یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (الحجرات : ۱۳)

لیس منا من دعا الیٰ عصبیۃ ولیس منا من قاتل علیٰ عصبیۃ ولیس منا من مات علیٰ عصبیۃ (ابوداؤد)

قومیں بھی، رنگ و نسل بھی اور زبانیں بھی سب کی سب ملک اسلامی کے اندر صدیوں سلامتی کے ساتھ زندہ رہیں جبکہ دوسری جانب انسانی سماج میں اس فیاضی اور کشادگی کے لئے مطلقاً گنجائش نہ تھی۔ وہاں قومی تعصب کا اقتدار تھا۔ امریکی ریاست ہائے متحدہ اور جنوبی افریقہ میں رنگ کا مسئلہ برابر انسانی ضمیر سے ٹکرا رہا ہے۔ چند سال پیشتر نازیوں کا فلسفہ آری قومیت کی امتیازی شان پر قائم تھا اور آج اسرائیل اللہ کی برگزیدہ قوم ہونے کی کہانی کا سہارا لے رہا ہے۔

کامل نظام

اسلام نے انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر ایک ایسا مکمل انصاف پسند نظام برپا کیا ہے جس کی نظیر نہ پیشتر تھی اور نہ اب ہے نہ کل ملے گی۔ جس وقت وہ انسان کی روحانیت کو بلند مقام اور اسے اخلاق کے مثالی اصولوں کی سند دیئے رہا ہوتا ہے اس وقت وہ حیات انسانی کے اندر مادی حقائق سے چشم پوشی بھی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کے قوانین معنوی و مادی امور اور روحانی تشکیلات اور مادی ضمانتوں کا ایک حسین اور معتدل امتزاج پیش کرتے ہیں۔

یہیں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مغرب نے جس مفہوم میں مذہب کو استعمال کیا ہے اسلام اس مفہوم میں کوئی مجرد مذہب نہیں ہے بلکہ وہ انسانی زندگی کے لئے ایک مکمل پروگرام ہے جو عالم روحانیت سے لیکر عالم مادیت تک پھیلا ہوا ہے۔ انفرادیت سے لیکر اجتماعیت تک، انفرادی احساسات سے لے کر نظام حکومت تک اور عبادات سے لے کر اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی معاملات تک اس کا دائرہ کار وسیع ہے۔

مذہب اور حکومت اور عقیدہ و سیاست وغیرہ کی اصطلاح جیسا کہ مغرب میں پائی جاتی ہے، اسلامی لغت میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ "دین اسلامی" کی اصطلاح ان سارے مصطلحات کو حاوی ہے، مسلمان مسجد میں نماز ادا کرتا ہے، بازار میں خرید و فروخت کرتا ہے، عدالت میں جھگڑوں کا تصفیہ کرتا ہے اور میدان کارزار میں حق و انصاف کے نام پر جنگ لڑتا ہے۔ یہ ساری کی ساری چیزیں ایک ہی اسپرٹ ایک ہی قانون اور ایک ہی عقیدہ کے تحت اور صرف ایک ہی نظام کے سایہ میں، جسے ہم اسلامی نظام کہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اسلام اس بلند ترین نظام کو عقیدۂ الٰہی کی اساس پر قائم کرتا ہے، تقویٰ الٰہی سے بھرپور ضمیر کو تشریع و تنفیذ کا نگہبان قرار دیتا ہے۔ اور اس ضمیر کے تعلق باللہ کو اس نظام کے لئے اولین ضمانت گردانتا ہے۔ تمام قوانین سے فرار کے لئے حیلے اور بہانے تراشے جا سکتے ہیں، لیکن یہاں دیدۂ الٰہی جو خوابیدہ نہیں ہوا کرتا وہ دیدۂ نگراں ہے جو ہمہ وقت بیدار رہتا ہے یہاں کسی حیلے بہانے کی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام اپنا نظام ضمیر کی حساسیت کی بنیاد پر کھڑا کرتا ہے جو کھلے اور پوشیدہ تمام حالات میں خلاق نگراں ہے۔ علاوہ ازیں اس نظام کی ایک اور بنیاد ہے اور وہ ہے اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی تنظیم جن پر ہم تفصیلی گفتگو کریں گے۔

دو باتیں

مذکورہ تنظیمات پر گفتگو کرنے سے پیشتر دو باتوں کو پیش کر دینا ضروری ہے۔

۱۔ اسلام کی دعوت تنہا کسی مسلمان یا جماعت کی وراثت نہیں۔ کارکنان اسلام جس وقت اسلام کی دعوت پیش کرتے ہیں اس وقت وہ کسی پر آقائیت یا حاکمیت کا دعویٰ نہیں کر رہے ہوتے ہیں اور نہ اپنے لئے کسی مخصوص منصب کے متمنی ہوتے ہیں جو انہیں اسلام سے مل سکتا ہو، یہاں اقتدار اور منصب صرف کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کو حاصل ہے۔ مسلمان ان کے آگے برابر ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔

۲۔ ہر زمانہ میں، کتاب و سنت کے نصوص و احکام کی تشریح کا مسئلہ ہو یا زندگی میں پیش آمدہ کسی نئے مسئلہ کی بحث ہو ان سارے ہی تقاضوں اور مطالبوں کی تکمیل کے لئے امت کے اہل الرای حضرات کی طرف رجوع کیا جائے گا، کسی ایک جماعت کو اس سلسلہ میں مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کے حکم سے مراد کتاب و سنت کا حکم ہے جس میں امت بحیثیت مجموعی شریک ہے۔ بنا بریں کسی بھی اختلافی مسئلہ میں کسی فرد یا گروہ یا جماعت کو حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اس اختلاف کو رفع کرے، اور اگر کوئی جماعت اس کے لئے مجبور ہے تو اس کا خیال ایک تجویز سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ امت کو اختیار حاصل ہے کہ اسے قبول کرے یا رد کر دے۔

اجتماعی پہلو

۱۔ فرد صالح : ہر صالح معاشرے کی بنیاد ہے۔ مرد ہو یا عورت [illegible]لام نے اس کی صالح تربیت کا خیال رکھا ہے اور اسے اپنے تئیں اللہ کے سامنے مسئول اور جوابدہ قرار دیا ہے" کل نفس بما کسبت رھینۃ " مسئول اس لئے بنایا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے ہودگی اور گندگی سے پاک کرے اور زندگی میں جسم و روح کے تقاضوں کی تکمیل کا مسئلہ درپیش ہو تو توازن و اعتدال رکھے۔ وابتغ فیما اتاک اللّٰہ الدار الاخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا

فرد صالح کی تعمیر و تربیت کے لئے اسلام نے تین فریضے عائد کئے ہیں۔

(۱) فریضہ تعلیم :۔ " طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم " مطلب یہ کہ مسلمان مرد ہو یا عورت، علم سیکھنے کا ذمہ دار ہے۔ اس پر تعلیم حاصل کرنا فرض ہے اس لئے اس کے اسباب کا فراہم کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک کتاب و سنت میں واردشدہ اسلام کے ارکان و فرائض اور اخلاقیات کا تعلق ہے ان کا سیکھنا تو ہر مسلمان پر فرض عین ہے، باقی رہے دوسرے علوم و معارف قرآن کا سیکھنا تمام امت پر فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے، اپنی ضرورت کے مطابق اگر وہ ان علوم سے واقف نہیں ہوتی تو گنہگار ہے۔

یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ عمومی تعلیم کا دائرہ اتنا وسیع رکھے کہ ہر علم و فن کے سلسلہ میں امت اپنی ضرورت پوری کر سکے اور تعلیم و تربیت کا ایسا نظام قائم کرے جو امت کی شخصیت کا محافظ اور اس کے وجود و حیات کا امین ہو۔ امت کے فرزندوں کی شخصیتوں کی تکمیل کرتا ہو اور ان کے اندر زندگی اور فکر و خیال کی یکسانیت پیدا کرتا ہو۔

(۲) " فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر " ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

" ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر "

اہم بات یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کو اس بات کی یاددہانی کرائی جا رہی ہے کہ وہ اللہ کے سامنے مسئول اور جوابدہ ہیں۔

اس کے اندر اس شخصی ضمیر کو مستحکم کیا جاتا ہے جس سے قانون و احکام کی سلطانیت بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اسی کے پہلو بہ پہلو یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ عوام کا رخ پھیرنے کے وسائل مثلاً ریڈیو، صحافت، مطبوعات اور سینما وغیرہ جیسے سب ذرائع ہیں وہ فرد کے لئے اسلام اور دینی اخلاقیات کی منشا کے مطابق پاک و صاف زندگی مہیا کر سکتے ہیں۔

(ج) جرم و سزا کا قانون: جہاں شخصی کردار مفقود ہو وہاں کی فضا کو جرائم کے جراثیم سے پاک کرنے کے لئے قانون کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ کی آیات بھی قرآن میں بہت کم اور محدود ہیں جبکہ قرآن کا کوئی صفحہ بھی دعوت الی الخیر اور نہی عن المنکر سے خالی نہیں ملتا۔ اس سلسلہ کی جو آیات ہیں وہ انتہائی سخت اور شعلہ فشاں ہیں کیونکہ سزا کا قانون اسی وقت پیش کیا گیا ہے جبکہ اُمت جرائم کے اسباب کو فنا کرنے کی ہر ممکن سعی و کاوش کرتی ہے۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹ لینا بلاشبہ ایک سنگین سزا ہے مگر جب اس قانون کا تصور اُس سماج کو پیش نظر رکھ کر کریں۔ جو ہر فرد معاشرہ کی ضرورتوں کی اس طرح پر تکمیل کرتا ہو کہ یہاں بھوک یا کسی ضرورت سے مجبور ہو کر سرقہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو نیز یہ حقیقت بھی پیش نگاہ رکھیں کہ سرقہ کا نصاب مقدار سے زیادہ کا ہو، قانون کی نگاہ میں انتہائی سنگین جرم ثابت ہو جائے اور اس کا ثبوت اس طرح فراہم ہو جائے کہ معمولی شبہ بھی باقی نہ رہے، تو آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس معاشرہ کے امن و امان کو تباہ کرنے والا یہ فعل کتنا گھناؤنا اور سنگین ہے جو معاشرہ کہ اس کے تمام حقوق کا امین ہے پھر سمجھا جا سکتا ہے کہ ہاتھ کاٹ لینے کا قانون کس قدر مبنی بر حق و انصاف ہے جو سرکش اور بندۂ حرص و آز کو معاشرے سے دور کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ لاقانونیت اور انتشار کے بعد اسلامی ملکوں میں پورا امن محض زیادہ سے زیادہ چھ ہاتھوں کے کاٹنے کے بعد قائم ہو گیا۔

۲۔ <u>خاندان</u>۔ تعمیر معاشرہ میں گوشہ کا پتھر (TURNING STONE) بنتا ہے۔ مرد اور عورت اس کے دو عناصر ہیں جن سے یہ قائم ہوتا ہے۔ ان دونوں کے مابین قائم شدہ تعلق کا اسلام نے اعلان کیا ہے۔ چنانچہ آپ کا فرمان ہے۔ "النساء شقائق الرجال" اس نے نکاح کے رابطہ کو تمام خاندان کی بنیاد بنایا ہے۔ اس کے علاوہ تعلق کی ہر نوعیت کو جو خاندان کے وجود اور تعمیر معاشرہ کے حق میں زہر ہلاہل ہے خطرناک تصور کرتا ہے۔

مرد اور عورت کے مابین عمومی تعلق ظاہر کرتے ہوتے اور "انہیں" "بھائی بہن" کا تصور دیتے ہوئے خاندان کے دائرہ میں ان کے تعلقات کی تعیین کرتا ہے اور اسے حقوق و فرائض میں مساوات کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے۔

ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف وللرجال علیهن درجة۔

یہ درجہ بھی محض انتظامی ہے، جس کے بغیر کوئی شرکت یا رفاقت باقی نہیں رہ سکتی۔ پھر زندگی کی یہ رفاقت تو اُس مرتبہ کی اور زیادہ محتاج ہے جس پر امت کی نسلوں کا دار و مدار ہے۔

خاندان کی تاسیس، گھر کی کفالت اور نیک ماحول کے لئے اسلام نے چند باتوں کا لحاظ رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ مثلاً شوہر کو اپنی بیوی کے انتخاب میں آزادی حاصل ہے اسی طرح عورت کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے شوہر کا انتخاب کرے آپ نے مغیرہ بن شعبہ کو وصیت کی کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ لے تاکہ انہیں اندازہ ہو جائے کہ وہ ان کے لئے اہل ہے یا نہیں۔ اسی طرح ایک دوشیزہ کو اختیار دیا کہ اپنے شوہر کے ساتھ تعلق نکاح کو فسخ کر سکتی ہے کیونکہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کر دی تھی۔

خاندانی امور کو چلانے میں میاں بیوی کا باہمی مشورہ کرنا ضروری قرار دیا۔ کیونکہ اگر قرآن شوہر اور مطلقہ بیوی کے لئے دودھ

چلانے کے سلسلہ میں باہمی مشورہ اور رضا کا حکم دیتا ہے " وان ارادا فصالا عن تراض منھما وتشاور فلا جناح علیھما " تو گھریلو زندگی کے اندر ان کا باہمی مشورہ کے ساتھ رہنا تو اور زیادہ اولیٰ و انسب قرار پائے گا۔

لباس کے آداب، غض بصر، گھروں میں داخلہ، اجنبی عورت سے خلوت میں نہ ہونے کی حرمت اور زوجیت کے اسرار درون پردہ کے احترام کی تعلیم دی گئی۔

اخراجات اور مادی ضرورتوں کی تکمیل مرد کے کندھوں پر رکھی گئی اور عورت کو اس سے معاف رکھا گیا لیکن اسی کے ساتھ اگر وہ کام کرنا چاہتی ہے تو اسلام کمائی میں اس کے مکمل حقوق کی کفالت بھی کرتا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے وہ عورت کو خود اپنے مال کے اندر تصرف کا پورا پورا اہل گردانتا ہے۔ اس نے اس کے فرائض کے سوا ہر شئے سے معاف رکھا ہے لیکن اگر معاشرے کو ضرورت ہے کہ وہ گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل کر اپنا فرض ادا کرے تو اس وقت اسے معاف نہیں کرتا۔ ام عطیہ انصاری فرماتی ہیں۔ " رسول اللہ کے ساتھ میں سات لڑائیوں میں شریک رہی، قافلے سے پیچھے رہتی، لوگوں کے لئے کھانے پکاتی، زخمیوں کو دوا پہونچاتی اور . . . . " مگر باہر نکلنے کے لئے شوہر کی اجازت شرط ہے۔ تاکہ گھر کا استقلال قائم رہے کیونکہ یہی گھر کی بنا ہے۔ ہاں اگر دشمن مسلمانوں کے ملک پر حملہ آور ہو تو اس وقت فقہاء نے اجازت دی ہے کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل سکتی ہے، اس شر و فساد کو دور کرنے میں معاون بن سکتی ہے جس سے پوری امت خطرہ میں ہوتی ہے۔

۳۔ اجتماعی کفالت : اجتماعی زندگی کی واضح علامت اور اسلام میں اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے۔ جب کفالت سے متعلق گفتگو ہوتی ہے اور دینی عقیدہ کا رول دیکھا جاتا ہے تو ذہنوں میں احسان، صدقہ، نیکی جیسے الفاظ اور زیادہ تر زکوٰۃ کا لفظ فوراً آتا ہے لیکن یہ الفاظ اور ان کے مفہوم اس رول کی حقیقت کی نمائندگی نہیں کرتے جو اسلامی عقیدہ، اجتماعی کفالت کے میدان میں ادا کیا کرتا ہے[1]

اسلام میں اجتماعی کفالت ایک کامل ترین اجتماعی نظام کی صورت ہے اس میں ہر وہ مفہوم شامل ہے جو کسی بھی " نظام اجتماع " کی اصطلاح میں لیا جاتا ہے اس کا مطلب صرف اسی قدر نہیں ہے کہ مالی تعاون دے دیا جائے اور بس، جیسا کہ " اجتماعی ضمانت " اور " اجتماعی حفاظت و دفاع " جیسی اصطلاحات کا مقصد ہوا کرتا ہے بلکہ مالی امداد تو اس کے کفالتی نظام کی صرف ایک نوعیت ہے۔

(۱) اسلام ابتداہی میں کفالت کو ایک تعلق کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ جو فرد اور اس کے ضمیر کے مابین قائم ہوتا ہے چنانچہ فرد کو اللہ تعالیٰ کے سامنے مسئول قرار دیتا ہے، اسے طیبات سے فائدہ اٹھانے اور خبیث اشیاء کے استعمال سے روکتا ہے۔ اسے راحت و عیش کا حق بخشتا ہے، چنانچہ اسے یوں نہیں چھوڑتا کہ بیکاری سے اس کے ہاتھ پیر شل ہو جائیں یا محنت و مشقت سے اس کی کمر ٹوٹ جائے۔

فرد اور اس کے ضمیر کے مابین اس طرح کی باہمی کفالت ایک طرح کا تربیتی نظام ہے جو فرد کے ضمیر اور اس کے احساس کو پیدا کرتا ہے۔ اس کی شخصیت اور ارادہ کو استحکام بخشتا ہے۔ آزادی اور ذمہ داری دونوں باتوں سے شخصیت کے

---

[1] سید قطبؒ کی کتاب العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام کا مطالعہ کیجئے جس کا اردو ترجمہ "اسلام کا عدل اجتماعی" کے عنوان سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

اندر عظیم استقلال رونما ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک انفرادی کفالت ہے مگر فی الحقیقت اسے پھیلایا جائے تو یہ ایک اجتماعی کفالت کا نظام ہے۔ کیونکہ اس نہج پر نفسیاتی تربیت کا مطلب یہ ہو اگر اسے اجتماعی زندگی کے میدان کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ اس تہذیب و تربیت کے عمدہ ترین نتائج نکلتے ہیں جو اجتماعی اور انسانی سلوک کے لئے عمدہ غذا ثابت ہوتے ہیں۔

(ب) فرد کے ضمیر سے فارغ ہو کر اسلام خاندان کی طرف توجہ دیتا ہے اور اسے ایسی کفالت کی مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کرتا ہے جس سے فوائد و نقصانات اور حقوق و واجبات میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ تعمیر معاشرہ کے اندر خاندان اولین اینٹ کا کام دیتا ہے چنانچہ جب یہ اجتماعی کفالت کی بنیاد پر اٹھایا جائے گا تو لازماً حکومت پر اجتماعی بوجھ کم سے کم ہوگا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس بوجھ کی ایک بڑی مقدار خود خاندان ہی سنبھال لے۔ خاندان کی یہ اجتماعی کفالت محض معاشی کفالت ہی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح کی انسانی کفالت کا نظام ہے جو مکمل ترین ہوتا ہے جہاں فرض ہے کہ ماں کی حمایت کی جائے، بچوں کی نگہداشت کی جائے۔ ماں باپ بوڑھے ہوں تو ان کا خیال کیا جائے۔ مادی ذمہ داریوں کی حد تک جس پر خاندان قائم ہوتا ہے اور جس کے متعلق انسان کی خواہش ہے کہ کارگہ حیات میں مرد اور عورت کے مابین اعتدال پیدا کیا جائے۔

(ج) خاندان سے نکل کر جماعت کی طرف آئیں تو یہاں اجتماعی کفالت کا نظام سارے اجتماعی تعلقات کو حاوی نظر آتا ہے مال و معیشت کے حدود تک ہی نہیں رہ جاتا۔ ہر فرد اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے مخصوص کام کو بحسن و خوبی انجام دے کیونکہ اس کے کام کا فائدہ جماعت پر عائد ہوتا ہے، نیز اس بات کا مکلف ہے کہ اپنے نفس کو اور دوسروں کو منکر سے روکے، جماعت کے حدود کا لحاظ رکھے اور طاقت بھر اس کی رضامندی کی راہ میں کوشش کرے۔

قرآن پاک نے عمل پر پوری صراحت سے ابھارا " وقل اعملوا " (التوبہ) آنحضورؐ اس سلسلہ میں ایسے سبق دیتے ہیں جو معاشرہ کی تعمیر کے لئے مخصوص طرز کی ذہنیت فراہم کرتے ہیں مثلاً آپ کا یہ ارشاد " قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان تم میں سے کوئی اپنی رسی کے لئے پہاڑ پر جائے، لکڑیاں کاٹے، پھر اسے اپنی پیٹھ پر لاد کر لے آئے اور کھانے کا انتظام کرے یہ دریوزہ گری سے زیادہ بہتر ہے " (بخاری اور احمد کی روایت ہے) علاوہ ازیں آپ ہر مسلمان کے قلب میں اجتماعی اسپرٹ کا بیج کچھ اس انداز سے ڈالتے ہیں کہ " سب سے بہتر وہ ہیں جو سب سے زیادہ نفع بخش ہیں "

جماعت یا نمائندہ حکومت پر فرض ہے کہ وہ ہر فرد کے لئے علمی اور عملی اعتبار سے کام مہیا کرے اسی طرح کاموں کے لئے زیادہ سے زیادہ آسانیاں فراہم کرے، جو لوگ کام کی قدرت رکھتے ہوں ان کی کفالت کا بار اپنے کندھوں پر اٹھائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کام پر قدرت رکھنے والے کو رزق کی تلاش میں بھیجتے ہیں اور اسے صدقہ نہیں دیتے اس کے لئے کام کا ذریعہ فراہم کرتے ہیں تاکہ اس سے وہ لکڑیاں کاٹ سکے اسی طرح ہمیں نظر آتا ہے کہ آپ کام کرنے والے کے حق کی کفالت بھی کرتے ہیں چنانچہ فرمایا " تین شخص ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا مخالف ہوں گا۔ (۱) ایک وہ شخص جس نے مزدور رکھا ہو اور اس سے بھرپور کام لیا ہو لیکن اس کی مزدوری نہ دی ہو " آپ کی بیان کردہ ہر مثال اجتماع و معاشرت کی ایک سنت ہے جسے آپ نے جماعت اور اپنے بعد ہر زمانہ میں اس جماعت کی حکومت کے لئے چھوڑا ہے۔

(د) ہر کام کرنے والے کو ایک موزوں مکان جو اسے گرمی، سردی، بارش اور لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھ سکے ایک موزوں لباس جو گرمی کی تمازت اور سردی کی تکلیف سے بچا سکے اور مناسب کھانا جس سے وہ اپنی زندگی اور قوت کو محفوظ رکھ سکے ملنا ضروری ہے اسی طرح اسے حفاظتِ صحت حاصلہ اور اعادۂ صحت کے لئے مخصوص مراعات بھی حاصل ہونی چاہئیں

ہر زمانہ میں نقل و حرکت کے جو ذرائع ہوں ان سے بھی اسے ایک معتد حصہ پہونچنا چاہئے اور اگر وہ شادی کا ضرورتمند ہو تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس فطری ضرورت کی تکمیل میں اور حرام اور ناجائز تعلقات میں مبتلا ہونے سے روکنے میں اس کی اعانت کرے۔ آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔

"جو کوئی ہمارے کسی کام پر مامور ہو اور اس کے لئے گھر نہ ہو تو گھر بنا لے، بیوی نہ ہو تو شادی کر لے، ملازم نہ ہو تو اسے فراہم کرے، سواری کے لئے جانور نہ ہو تو ایک جانور بھی رکھ لے" (ابوداؤد)

حضورؐ نے یہ بھی فرمایا۔

"تمہارے بھائی تمہارے ملازم ہیں، پس جس کا بھائی اس کے ماتحت ہو اسے وہی کھلائے وہی پہنائے جو خود کھاتا اور پہنتا ہو اور اس پر کام کا اتنا بار نہ ڈالے کہ اس کا متحمل نہ ہو سکے اگر اس طرح کی ضرورت پیش آ ہی جائے تو اس کی مدد کرے"

(ھ) باقی رہے وہ لوگ جنہیں کام کرنے کی قدرت حاصل نہ ہو یا جو لوگ کام نہ پا رہے ہوں یا وہ لوگ جن کی آمدنی سے ان کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں تو ان کے لئے زکوٰۃ کا دروازہ کھلا ہوا ہے زکوٰۃ کوئی انفرادی احسان نہیں ہے کہ اسے آزاد رکھا گیا ہو بلکہ یہ ایک حق ہے جسے حکومت وصول کرے گی، عدم ادائیگی کی شکل میں جنگ کرے گی۔ اس سلسلہ میں آپؐ کا ارشاد ہے۔

"جو (مال زکوٰۃ) کو کسی مستحق تک پہونچاتا ہے تو اس کا اجر اسے ملے گا اور جو کوئی روکے گا تو ہم اسے وصول کریں گے اس کے مال کا ایک حصہ ...."

(ابوعبید فی کتاب الاموال، شوکانی فی نیل الاوطار)

حکومت اس زکوٰۃ کو تقریباً ان مصارف میں استعمال کرے گی جو بڑی حد تک "اجتماعی ضمانت" یا "اجتماعی حفاظت" جیسی اصطلاحوں کے مصارف سے مشابہ ہوتے ہیں ہر صوبہ کی زکوٰۃ پہلے اسی صوبہ کی ضروریات پر خرچ ہوگی، اگر کچھ بچ رہے گا تو وہ عام بیت المال کو بھیجا جائے گا تاکہ یہاں سے ملک کے تمام ضرورت مندوں کو بلا امتیاز مذہب و عقیدہ اور بلا تفریق رنگ و نسل پہونچایا جا سکے۔

(ص۵ کا بقیہ)

کہ "گزارش" (ز کے ساتھ) لکھنا چاہیے جس کے معنی کلام یا شرح و وضاحت کے ہوں گے اور گذارش غلط ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، مصدر "گذشتن" (ذ سے) یا اس کے مشتقات لکھتے وقت محتاط رہنا چاہئے مثلاً درگذشت، سرگذشت وغیرہ لکھتے وقت اور ان الفاظ کو "ز" کے ساتھ لکھنا صحیح نہیں ہے۔ گذشتن کے معنی "گذردن" (ذ کے ساتھ) یعنی گزرنا کے ہیں دونوں مضارع "گذرد" ہے۔ اسی طرح گذاشتن، جو گذشتن کا متعدی ہے، گذاردن کا ہم معنی ہے اور ان کا مضارع مشترک "گذارد" ہے۔ اس مصدر اور اس کے مشتقات تمام کے تمام "ذ" کے ساتھ ہی لکھنا چاہئے مثلاً فروگذاشت، درگذار، اور نقش گذار وغیرہ۔ فارسی میں "گزشتن" یا "گزاشتن" (ز کے ساتھ) ہمارے ہاں کے بعض بزرگوں کی طرح، کوئی نہیں لکھتا ہے۔

مندرجہ بالا مختصر گزارش ایک یاد دہانی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اگر اردو کے مصدر "گزرنا" کی اصل بھی فارسی کا "گذشتن" یا "گذردن" تسلیم کر لیا جائے، تو اسے بھی "گذرنا" لکھنا افصح و ارجح لگتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں مجھے اتنا اصرار نہیں ہے۔ البتہ مندرجہ بالا فارسی مصادر اور ان کے پسوندوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سردرد۔ کمر کا درد۔ دانت کا درد
ایام۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے

ڈاکٹر محمد ریاض

"گذاردن" - "گزاردن" اور "گذشتن"

فارسی زبان کے اُردو کی تشکیل پر بڑے ہی گہرے اثرات ہیں۔ اسماء و صفات کے علاوہ پسوند و پیشوندوں کی کثیر تعداد فارسی کے ذریعے ہی اردو میں وارد ہوئی ہے۔ جن چند مصادر کا اوپر عنوان قائم کیا گیا ہے ان سے بھی ہم نے الفاظ کی ایک کثیر تعداد بنائی ہے جن کو برتے اور لکھتے ہیں۔

"گذاردن" اور "گزاردن" مصدروں میں بہت بڑا معنوی فرق ہے۔ ایران میں چھپی ہوئی اکثر کتابوں کا جب مطالعہ کیا جائے تو اس فرق کا پورا لحاظ نظر آتا ہے مگر برصغیر پاکستان و ہند میں اب تک اکثر ایسی حالت نظر آتی ہے کہ ان دو مصدروں اور ان سے ترکیب پانے والے مصادر الفاظ میں کوئی خاص امتیاز نہیں کھینچا جاتا کہ آیا "ذ" سے لکھے جائیں یا "ز" سے؟۔ اس قسم کے شواہد مانند اگر پیش کی جائیں تو بات طویل ہو جائے گی اور ان میں کوئی ندرت یا جدت نہیں ملے گی۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایک ہی ادیب یا شاعر کے ہاں گذارش ہے اور گزارش بھی۔ سپاسگذار ہے اور سپاسگزار بھی۔ گویا کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

ان دونوں مصادر کی اصل ایران کی قدیم زبانوں ——— فارسی باستان، اوستا اور پہلوی میں ملتی ہے اور دونوں کے معانی حسب ذیل ہیں۔

(۱) گذاردن = نہادن یا گذاشتن یعنی کسی چیز کو رکھنا، چھوڑنا اور ترک کرنا۔ اس کے بعد پسوند فاعلی "گذار" سے (اصل میں "گذارندہ" ہے جس کا آخری "ندہ" حذف کر لیا جاتا ہے) یا دوسرے پسوندوں کے استعمال سے بنائے جاتے ہیں، وہ اسی مفہوم و معنی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً۔

بنیان گذار یا بنیاد گذار یعنی بنیاد رکھنے والا، گناہ گذار یعنی گناہ کو ترک کرنے والا، تاج گذار یعنی تاج کو (سر پر) رکھنے والا۔ واضح رہے کہ فارسی میں تاجپوشی کو "تاجگذاری" ہی کہتے ہیں۔ اسی طرح بے فرو گذار وغیرہ۔ گذردن کے معنی "گذشتن" یعنی گزرنے کے ہیں اور گزردن یا گزشتن لکھنا صحیح نہیں ہے (گزیدن، گرزیدن اور گزیریدن کے معنی علاج کرنے کے ہیں مگر بہت کم استعمال ہوتا ہے)

(۲) گزاردن کے کئی معنی ہیں (مگر اس میں مذکورہ "گذاردن" کے معانی کسی طرح بھی شامل نہیں ہیں)۔ اس کے حسب ذیل معانی ہیں: کسی کام یا فرض کو انجام دینا، شرح و توضیح سے بیان کرنا، ادا کرنا اور (خواب کے سیاق میں) تعبیر بتانا۔ اس سلسلے کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں: سپاسگزار (= متشکر)، نمازگزار (= نماز خواں)، خواب گزار (= معبّر)، روزہ گزار اور معنی گزار وغیرہ۔ اگر معانی جانتے ہوئے کوئی شخص ان کلمات کو "ذ" سے لکھے تو متضاد برعکس معانی نکلیں گے مثلاً سپاسگذار، ناشکرا ہوا اور کارگذار نکما (کام کو ترک کرنے والا)۔ واضح ہے

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

ساز و نغمہ

سید امیر حسن امیر گلاؤٹھوی :-

اختلاطِ غم ہی کچھ ہنگامہ آرا ہو تو ہو
سونے ہی کی لے میں کوئی ساز پیدا ہو تو ہو

حشر ہے اور آفتابِ حشر پھر ایسے سکوں
ہاں ترے دامانِ رحمت ہی کا سایہ ہو تو ہو

ناخدا کے بس کا یہ طوفاں نہیں ہرگز نہیں
ہاں خدا ہی کی طرف سے کچھ اشارہ ہو تو ہو

میں نے کب شکوہ کیا کس سے کیا کس کا کیا
اب کسی کا خود ہی جی چاہے کہ رسوا ہو تو ہو

میکدے میں پاؤں رکھتے ہی چھنا کا سا ہوا
جام تو سالم نظر آتے ہیں توبہ ہو تو ہو

اب نہ مرنے کی تمنا ہے، نہ جینے کا مزا
کوئی قاتل ہو تو ہو۔ کوئی مسیحا ہو تو ہو

آپ اور عذرِ جفا۔ دل کو یقیں آتا نہیں
یہ کسی تازہ جفا کا پیش خیمہ ہو تو ہو

سید آغا صادق حسین نقوی :-

چشمِ کرم نے جن کو نوازا تھا ایک بار
شائستۂ نوازشِ پیہم نہ ہو سکے!

ذرّے تری نگاہ سے خورشید بن گئے
شایانِ التفات بس اک ہم نہ ہو سکے!

ساقی مجھے پلا تو کچھ اس ڈھنگ سے پلا
احساسِ بے ثباتیٔ عالم نہ ہو سکے

کتنی ہی مہر و ماہ میں سرگوشیاں ہوئیں
لیکن ترے جمال کے محرم نہ ہو سکے

محسن نقوی :-

ہم رہ یاراں میں کیا گُل کھلائے گئے
ہر قبا پہ ستارے سجائے گئے

اپنی قسمت میں شامِ غریباں رہی
آپ جشنِ چراغاں منائے گئے

اتفاقاً کوئی تصور تاریک تھا
اتفاقاً کئی گھر جلائے گئے

کیا غضب ہے کہ جلتے ہوئے باغ میں
بجلیوں کے فضائل سنائے گئے

اپنی صورت بھی اک وہم لگتی ہے اب
اتنے آئینے مجھ کو دکھائے گئے

حد سے بڑھنے لگی بدگمانی مری
آپ نے چھیڑ دی پھر کہانی مری

ایک پل ٹھہر جا غمِ دو جہاں
مشورہ چاہتی ہے جوانی مری

سنگدل دوستوں کے حسیں شہر میں
کام آئی بہت سخت جانی مری

نازش پرتاب گڑھی :-

قوتِ دستِ عمل ہو نہ پسِ پشت اگر
توڑ سکتا نہیں شیشے کو بھی پتھر تنہا

سلیم فاروقی :-

تری طلب میں جو آنسو بہائے جاتے ہیں
انہیں سے گوہر و انجم بنائے جاتے ہیں

جبیں پہ زلف پریشاں ہے دیکھیے کیا ہو
حیات و موت کا ساماں ہے دیکھیے کیا ہو

ہماری نظر میں

تفسیر ابنِ جریر رح (اُردو) تالیف :- امام ابو جعفر محمد بن جریرؒ طبری، اُردو ترجمانی :- ظہور الباری اعظمی ۔
ضخامت ۲۰۹ صفحات ، ہدیہ ۔ دو روپے
ملنے کا پتہ :- بیت الحکمت ۔ دیوبند (یو۔پی)

یہ امام جعفر محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تفسیر (پارۂ اول کے جزو سوم) کا اُردو ترجمہ ہے، قرآنِ پاک کے متن کا ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی کی "بیان القرآن" سے لیا گیا ہے۔ تفسیر میں مضامین کے عنوانات قائم کئے گئے ہیں، مثلاً :-

سحر کی حقیقت ــــــ بارگاہِ رسالت کے آداب ــــــ ہاروت ماروت کے واقعہ کی تفصیل ــــــ تعمیر کعبہ ــــــ ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش ــــــ عقیدۂ ابنیت کی تردید ــــــ دُعاءِ ابراہیمیؑ ــــــ !

ان عنوانات سے تو قرآنی مضامین کا تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے مگر ــــــ

فتنہ انگیزی ــــ معیار ــــــ خام خیالی ــــــ کاش عقلِ سلیم سے کام لیتے ــــــ

تنبیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ـــ !

اس قسم کے عنوانات قائم کرتے ہوئے فاضل مترجم نے غور و فکر نہیں کیا، قرآنی مضامین کا "اشاریہ" (انڈکس) بڑی محنت اور تدبر و تفکر چاہتا ہے۔ جہاں تک تفسیر کی ترجمانی کا تعلق ہے وہ عام فہم اور سلیس ہے، مولانا ظہور الباری اعظمی صاحب نے بعض مقامات پر مفید حواشی بھی لکھے ہیں۔

امام طبریؒ بہت بڑے آدمی ہیں، مگر امام صاحب موصوف نے روایات درج کرنے میں احتیاط نہیں برتی، حیرت ہے کہ بعض کھلی ہوئی موضوع روایتیں اور اسرائیلی افسانے انہوں نے تحقیق کئے بغیر درج کر دئے ہیں! اسلامی ادب میں "فنِ تفسیر" کمزور فن ہے! متاخرین نے متقدمین کے مقابلے میں زیادہ احتیاط برتی ہے (رحمہم اللہ تعالیٰ)

ان کمزوریوں کے باوجود قرآنِ کریم کا کوئی شارح اور مفسر "تفسیر ابن جریرؒ" سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، انہی خزف ریزوں سے لعل و گہر رولے جاتے ہیں!

مسلمانوں کے عقائد و افکار از :- علامہ ابو الحسن اشعری، ترجمہ :- مولانا محمد حنیف ندوی (باضافہ مقدمہ و تعلیقات) ضخامت ۴۰۰ صفحات
ملنے کا پتہ :- ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

علامہ ابو الحسن اشعری کی معرکہ آرا کتاب ــــ مقالات الاسلامیین ــــــ کا ترجمہ مولانا محمد حنیف ندوی نے کیا ہے اور اس پر عالمانہ اور فلسفیانہ مقدمہ لکھا ہے، کتاب کے آخر میں "تعلیقات" ہیں، جن کے پڑھنے سے بعض کلامی اصطلاحیں سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور

ہی اہم شخصیتوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔

شہرستانی اور ابن حزم کی کتابوں کی طرح اس کتاب (مقالات الاسلامیین) میں بھی ملت اسلامیہ کے مختلف فرقوں کے عقائد و کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عقل کی موشگافیوں اور نکتہ سنجیوں نے دین فطرت کی سادگی کو کس قدر مجروح کیا ہے سفہ و کلام کی مدد سے دین میں کیسی کیسی گمراہیوں کو پاپانے کا موقع ملا ہے، اور ان گمراہیوں نے ابن الراوندی جیسے ملحد دانشوروں دیا ہے ۔

اس کتاب میں خوارج و روافض کے بعض ایسے فرقوں کا بھی ذکر ہے جن کا ہمارے اس دور میں شاید ہی کہیں وجود ملتا ہو، ان فرقوں ں نام تک ہمارے لئے اجنبی ہیں !

حیرت ہے کہ علامہ ابوالحسن اشعری نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے مقلدین کو ،، مُرجئہ " کا نواں فرقہ قرار دیا ہے ، ضرف اور فقہ حنفی کے دوسرے ائمہ و عمائدین تو کہتے ہیں کہ ـــ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے ایمان زائل نہیں ہوتا ، فاسق اگرچہ بُرے سلمان ہے مگر وہ غیر مومن یا کافر نہیں ، مومن ہی ہے ، لیکن اُن کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ جس طرح کفر کی حالت میں کوئی نیکی نفع نہیں تی ، اسی طرح ایمان کی حالت میں کوئی گناہ اخلاقی نقصان نہیں پہونچاتا ! امام ابوحنیفہ اور احناف کا عقیدہ " ارجاء " سے کوئی نہیں ہے ! اسی قسم کی کتابوں سے متاثر ہو کر حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے احناف کو " مُرجئہ " کہا ہے احناف مت سے بری ہیں ـ

"امام (ابوحنیفہ) کو مرجئہ کہنے والے دو گروہ ہیں بعض محدثین اور وعیدیہ"

" بعض محدثین نے تو اس بناپر ان کو " مُرجئہ " کہا کہ امام نے ایمان کو مقدم ٹھیرایا اور عمل کو موخر اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں ، اس صورت میں امام اور بعض محدثین میں اختلاف اصول اور بنیاد کا نہیں رہتا بلکہ اختلاف کی نوعیت یہ شکل اختیار کرلیتی ہے کہ جہاں امام نفس ایمان کی نشاندہی کرتے ہیں ، وہاں محدثین ایمان کے تکمیلی تقاضوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں

اور " وعیدیہ " نے اس وجہ سے حضرت امام کو تہمت ارجاء سے متہم کیا کہ امام اُن کے اس غالیانہ عقیدہ کا ساتھ نہ دے سکے کہ مرتکب کبیرہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا ـ "

اس کتاب میں " گروہ زہاد " کے عنوان کے تحت زہاد کے اس گروہ کا ذکر کیا ہے ، ـ

" یہ سمجھتے ہیں کہ عبادت سے ان کو ایسا مقام حاصل ہو جاتا ہے ، جہاں عبادات ساقط ہو جاتی ہیں اور زنا کے قبیل کی ممنوعہ اشیاء مباح قرار پاتی ہیں "

" . . . . اور عبادت اُنہیں ایسا مقام عطا کرسکتی ہے ، جو انبیاء اور ملائکہ مقربین سے بھی افضل ہو "

کفر آمیز ضلالت کے سوا اور کیا ہیں ؟ معاذ اللہ !

مولانا محمد حنیف ندوی نے ترجمہ میں معیاری زبان استعمال کی ہے لیکن ایک دو جگہ کھٹک پیدا ہوئی ـ

" . . . . . تو ان کے اسلحہ ، اور مال ڈھور پر " (ص۱۱۱)

ر کی جگہ " مویشی " ترجمہ زیادہ مناسب تھا ، " مال ڈھور " میں " اور " نہ آنے سے اس کا التباس ہوتا ہے کہ " ڈھور " مال ہی کی

ی قسم ہے !

"عالم ہے تو علم کی بدولت، قادر ہے تو قدرت کے ساتھ حیات کے ساتھ ..." (ص ۱۰۳)

اسماء و صفات کے بارے میں عبداللہ بن کلاب کے عقائد کی جو تشریح کی ہے، اس میں یہ عبارت نظر سے گزری، اس میں اللہ ی کے لئے "علم کی بدولت" کی جگہ "علم کے ساتھ" ترجمہ کرنا تھا

صفحہ ۶۶ پر کتابت کی غلطی کے سبب "طفرہ" (ف کے ساتھ) کی بجائے "طغرہ" (غ کے ساتھ) چھپ گیا، اس قسم کی کتابت کی یاں اوسط درجہ کی قابلیت کے قارئین کو غلطی میں ڈال سکتی ہیں۔

فاضل مترجم کی "تعلیقات" عالمانہ اور مفکرانہ ہیں، صرف ایک نمونہ :-

"یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ازل سے قدرت، علم، اور سمع و بصر سے متصف نہیں، اس بنا پر ہے کہ ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے ان تمام صفات کا مرتبہ فعل و خلق کے بعد ہے ......"

"اس اندازِ فکر میں گھپلا ہے کہ یہ لوگ صفات اور ان کے اثرات و نتائج میں فرق محسوس نہیں کرتے یہ صحیح ہے کہ فعل کے لحاظ سے سمع و بصر اور قدرت کا مرتبہ تخلیق و آفرینش کے بعد ہی ہے لیکن ازل سے وہ ان معنوں میں سمیع و بصیر اور قادر ہے کہ اس کی ذات گرامی ان صفات سے قوت کے درجہ میں ہمیشہ متصف ہے۔"

"رہا علم تو یہ ایسی صفت ہے کہ جس کے لئے خلق و آفرینش شرط نہیں بلکہ خود تخلیق و آفرینش کے لئے علم بمنزلہ ضروری شرط کے ہے"

اوّل تو کتاب ہی اپنی جگہ معرکہ آرا ہے، پھر مولانا محمد حنیف ندوی کے مقدمہ اور تعلیقات نے اس نخیلط جواہر میں علم و افکار ل وگہر کا اضافہ کر دیا ہے، کلام و فلسفہ کی تشریح و ترجمانی میں مولانا منفرد شخصیت کے حامل ہیں، فلسفہ کے نازک و دقیق نک مسائل میں اُن کا انداز بیان بڑی دلکشی اور سلجھاؤ پیدا کر دیتا ہے۔

یہ کتاب اُردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہے، جس پر فاضل مترجم اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ تبریک و تحسین کے مستحق ہیں

یات ولایت از :- میر ولایت علی، ضخامت ۱۰۲ صفحات، قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بنی بہ ملنے کا پتہ :- ادارۂ علمیہ ۳۲۱ جدید ملک پیٹھ، حیدرآباد (۳۶) آندھرا پردیش، انڈیا)

ی ہدایات میر ولایت علی کی دو کتابوں پر "فاران" میں تبصرہ ہو چکا ہے، میر صاحب کی یہ کتاب بعض مشاہیر کے نام اُن ہوئے خطوط اور بعض ملاقاتوں کے تذکرے پر مشتمل ہے، وہ ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کا جذبہ رکھتے ہیں اور اخلاق و نیکی اور عدل و انصاف پہ دنیا کی اصلاح چاہتے ہیں مگر غور و فکر کی غیر ضروری شدت کے سبب ژولیدگیٔ افکار میں مبتلا ہو گئے ہیں! اُن پر سب سے زیادہ اثر رقی کے افکار و خیالات کا ہے۔

"..... مولانا (آزاد) نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں "وحدت دین کی اصل عظیم" کا جو باب باندھا ہے اُس میں علامہ مشرقی کے مذکورہ بالا خیال کو اس سلیقہ سے منضبط کیا ہے کہ گویا سونے پر سہاگہ چڑھ گیا ہے۔" (ص ۲۹)

م کی حکمت بصورت بحث"

"وحدتِ ادیان" کا فلسفہ بھی اسلامی نقطۂ نگاہ سے غلط ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ترین دین اسلام اور صرف اسلام ہے! "وحدتِ ادیان" کا تصور راجہ رام موہن رائے اور مسز اینی بیسنٹ کے افکار کی صدائے بازگشت ہے۔

"اس کے بعد جناب حسن الدین احمد صاحب نے اُردو بھگوت گیتا، شائع کرائی، جو ذاتی
تعلقات کی بدولت کچھ نکل گئی، کیونکہ آج کا مسلمان تو دوسرے مذہب کی کتاب کو ہاتھ لگانا
گناہ سمجھتا ہے۔" (ص ۲۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں انجیل (یا توریت) کے اوراق دیکھ کر ناگواری کا اظہار فرمایا تھا ——— آج کے مسلمان اگر دوسرے مذہبوں کی کتابیں پڑھنے سے اجتناب کرتے ہیں، تو اس کے لئے قول رسولؐ کی سند رکھتے ہیں! قرآن پر ایمان لانے کے بعد مذہبی تحقیق کس لئے؟

"ان الکافرین لا مولیٰ لھم" کافر سمجھنے والی قوم کو قدرت کی جانب سے جو مدد و نصرت
یا فتح و کامرانی حاصل ہو رہی ہے یہ کس طرح؟ اگر وہ مدد خدا کی نہیں تو پھر کس کی ہے! اور اگر
خدا کی ہے تو انہیں کافر کہنا غلط ہے یا نہیں" (ص ۳۶)

خیر و شر سب اللہ ہی کی طرف سے ہیں ——— تو کیا اس عقیدے کی بنا پر "شر" محبت کرنے کی چیز ہے! یہ عقیدہ بھی سرے سے غیر اسلامی ہے کہ دنیا میں جو قوم بھی مادّی اعتبار سے غالب اور مرفہ الحال ہے وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ قوم ہے اور مومن ہے ——— اس لحاظ سے تو حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں اُن کی قوم اور حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں "قوم فرعون" ... "مومن" قرار پائیں گی! جس کسی نے بھی ترقی، خوش حالی اور دولت و سلطنت کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کا سبب ٹھہرایا، اُس نے بہادرے سے بھی زیادہ بڑی غلطی کی ———

"میں نے کہا نہیں مولانا، میری اور آپ کی بات میں زمین آسمان کا فرق ہے، آپ صرف ایک فرقے کو
مسلمان کہہ رہے ہیں اور باقی سب کو کافر اور میں کہہ رہا ہوں کہ مسلمان ہر فرقے میں ہوتے ہیں اور کافر
بھی ہر فرقے میں ہوتے ہیں، ہر فرقے کے مسلمان جنت میں جائیں گے اور ہر فرقے کے کافر جہنم میں جائیں گے" (ص ۶۹)

جو فرقے (جن کو مذاہب کہنا چاہئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق نہیں کرتے وہ قرآن کریم کی رُو سے کافر ہیں اور کفر کی حالت میں کسی کا کوئی نیک فعل آخرت میں کام نہیں آسکتا!

"خدا نے نجات کے لئے کسی خاص پیغمبر کے ایمان کی شرط نہیں رکھی ہے، نجات کا تعلق تو اللہ کے ایمان
اور اللہ کے احکام کی تعمیل پر منحصر ہے۔" (ص ۷۰)

یہ عقیدہ سو فیصدی لغو و باطل ہے! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کسی ایک ایسے شخص کی بھی مثال ملتی ہے کہ جو صرف "ایمان باللہ" رکھتا ہو اور اچھے کام کرتا ہو ——— اور اُسے "مومن" سمجھا گیا ہو۔

"... میں نے کہا علامہ مشرقی کانگریسی قائدین سے زیادہ بلند حوصلہ شخص ہیں، اُن کا خیال ہے کہ
انگریز قوم سپاہی ہے، اس کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لئے سپاہیانہ تنظیم کی ضرورت ہے۔" (ص ۷۰)

ہندوؤں کے ٹھاکروں، جاٹوں اور چھتریوں اور مسلمانوں کے پٹھانوں اور نو مسلم راجپوتوں کی طرح انگریز قوم سپاہی قوم نہیں ہے، ہاں! تاجر قوم ہے! انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے، فاتح کی حیثیت سے نہیں آئے ——— ہندوستان سے اُن کا بوریا

بستر باندھ کر چلے جانا، اس کا سبب بھی فوجی معرکہ آرائی نہیں ہے۔ خاکسار بیلچوں کے ذریعہ انگریزوں کو ہندوستان سے کس طرح نکال سکتے تھے!

"دیکھئے آج مہاتما گاندھی کے روزے قبول ہوئے۔
پنڈت نہرو کی نمازیں اور سردار پٹیل کا حج قبول ہوا۔" (ص۲۳۰)

ایک مسلمان اس قسم کے عقائد بھی رکھ سکتا ہے! استغفراللہ!

اسی کتاب میں میر ولایت علی صاحب نے کہا ہے کہ :-

"نجات کا تعلق تو اللہ کے ایمان اور اللہ کے احکام کی تعمیل پر منحصر ہے" (ص۱)

اس اپنے قول اور عقیدہ کے باوجود حیرت ہے کہ وہ پنڈت نہرو کے سیاسی غلبہ کی بناپر انہیں "مومن" و "صالح" سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ آشکارا بات ہے کہ پنڈت نہرو خدا کو نہیں مانتے تھے۔ وہ "ناستک" اور منکر خدا تھے!

"...... میں نے کہا ہندوستان کے مسلمانوں کی ہلاکت اور اُن پر انگریزوں کا تسلط خدا ہی کے حکم سے ہوا ہوگا! فرمایا ہاں! صحیح ہے، اس کے حکم کے بغیر یا اس کی مرضی کے خلاف کیسے ہوتا؟ میں نے کہا خدا کے فرشتے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں، یا خدا کی مرضی کچھ اور ہوتی ہے اور فرشتے کچھ اپنی مرضی چلاتے ہیں! کہنے لگے ایسا تو نہیں ہو سکتا! میں نے کہا جب خدا نے چاہا کہ ہندوستان پر انگریزوں کو مسلط کیا جائے تو اس وقت سارے فرشتے جو مامور بہ اطاعت ہیں، خدا کی مرضی پوری کرنے میں لگ گئے ہوں گے! فرمایا صحیح ہے، ان کی سرکشی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، میں نے کہا مولانا! خدا کے فرشتوں کا انگریزوں کے سجدہ گزار ہونا اسی کا نام ہے۔" (ص۵۳)

اس قاعدے، عقیدے اور اصول کی رو سے تو دنیا کے تمام زانی، شرابی، بدکار، قاتل اور لٹیرے فرشتوں کے مسجود ہیں، کیونکہ وہ ان کاموں میں اُن کی مدد کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم کے بغیر فرشتے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے! اس عقیدہ سے کروڑ بار توبہ!

یہ کتاب اسی قسم کی لغو اور بے عقلی کی باتوں سے بھری پڑی ہے، یہ صاحب اپنے اسی ضلالت آمیز مسلک کی ساری دنیا کو دعوت دیتے ہیں! اللہ تعالیٰ ان کی اصلاح فرمائے۔ (آمین)

انتخاب مضامین عظمت

مرتبہ :- علی اسداللہ، ضخامت ۳۲۸ صفحات، (مجلد، گردپوش کے ساتھ) قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ :- علی اسداللہ $\frac{C}{319}$ کوچہ شیر سنگھ، بازار تلواڑاں، راولپنڈی شہر

عظمت اللہ خاں مرحوم اُردو کے نامور ادیب ہیں، اب سے تقریباً چالیس سال پہلے اُن کی خاصی شہرت تھی مگر اب لوگ اُنہیں بھولتے جا رہے ہیں، ادبی تذکرے بھی اُن کے ذکر سے عام طور پر خالی ہی نظر آتے ہیں، مرحوم کے لائق فرزند علی اسداللہ صاحب کی کوششوں سے اُن کی چھپی ہوئی کتابیں جو گمنام ہوتی جا رہی تھیں، پھر منظر عام پر آ سکی ہیں!

اس کتاب میں عظمت اللہ خاں مرحوم کے منتخب مضامین ——— ادبیات ——— طنز و ظرافت ——— مزاح، خوش مذاقی ——— فلسفہ، نفسیات ——— شہابیات ——— تبصرے اور دیباچے ——— یکجا کئے گئے ہیں

عظمت اللہ خاں ایک صاحب فکر ادیب ہیں، سامنے کی باتیں فلسفیانہ انداز میں کہتے ہیں۔ مثلاً "بھیڑیا چال" جس مضمون کا عنوان ہے، اس میں بھیڑ کے جسمانی طور پر بے ضرر ہونے کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے ـــ

"... جارحانہ اعضاء اس بے چارے کو دئے ہی نہیں گئے، اور اس قسم کے فطری ہتھیاروں کے فقدان کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہے کہ بھیڑ بے چاری کسی کو ایذا نہیں پہونچا سکتی، بلکہ بڑی مصیبت یہ آپڑی ہے کہ یہ اپنے بچاؤ کی بھی استعداد نہیں رکھتی۔"

چند اور نمونے :—

● —"خاص طور پر دو چیزیں ہندوستانی ہیں، جن کی نظیر اور کسی ملک میں نہیں ملتی، میووں میں آم اور پیشوں میں بنیا"

● —"صدیوں سے اس (بنیئے) نے جارحانہ ہتھیاروں سے ہاتھ اٹھا لیا ہے، وہ اس قسم کے ہتھیاروں کا مقابلہ ہمیشہ اس اصول پر کرتا رہا ہے کہ "زور کے آگے جھک جاؤ" اور جھکو بھی اس قدر کہ زور والے کا سارا زور صرف ہو جائے، یہ ماننا پڑے گا کہ یہ بھی لڑائی کا ایک اصول ہے۔"

● —"ناامیدی کی جلن اور مایوسی کے ایندھن سے شورش کا بھڑک اٹھنا اچنبھے کی بات نہیں۔"

● —"جہاں اقتدار ہوگا، وہاں روغن تازہ کی مانگ ہوگی۔"

● —"محبت صرف عورت سے ہی نہیں ہوتی، انسان جس بات پہ اپنا دل لگا دے وہی عشق ہے۔"

دوسرا رخ :—

"اس کی جان اسی کے لئے ہے کہ دوسروں کا تن تازہ کرے۔" (ص۴۵) "تن تازہ کرنا" یہ کہاں کی زبان ہے —— "بھیڑ یا جبل کی ظاہری صورت تو یہ ہے کہ جدھر ایک بار قدم اٹھاتے دیکھا، اسی طرف اپنے قدم بھی اٹھنے لگے، یہ بہت ہی ابتدائی جن منجھی اور ادھ کچری صورت ہے" (ص۵۰) "بن منجھی" اور "ادھ کچری" اس جملے میں کھٹکتے ہیں، یہاں ان کے استعمال کا کیا محل تھا،

"تیر بہدف تشبیہ کا انتخاب شاعر کی نظر پہ منحصر ہے، کوئی نہیں سکھا سکتا (ص۲۰) تشبیہ کو "تیر بہدف" کہنا عجیب سی بات ہے ——

"جانداروں کے عضوی نظام میں خاص اعضاء تی آلات سے زیادہ حسن والے اور جان جیسی نازک شے کو کیمیائی ترکیب دینے اور اس کی رکھوالی کرنے والے وضع کئے گئے ہیں اور ان اعضاء کو ایسی لذت انگیز ارتقاء دی گئی ہے کہ اس لذت سے زیادہ کوئی لذت نہیں لیکن اس کی قوت کو بعض ترقیر نوع تک ہی محدود نہیں رکھا گیا (ص۱۱۶) یہ لفظی ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے!

"اس ذہنی گدگداہٹ کو جسے ہنسی کہتے ہیں، چیر پھاڑ کر جسم باطن کے سامنے لایا جائے، یہ عمل جراحی اسی حد تک نہ رہے بلکہ اگر ممکن ہو تو اس گدگداہٹ کے ان تاروں کو بھی اس نشتر کی نوک سے ابھار کر نکالا جائے۔" (ص۱۲۵) یہ انداز بیان کس قدر الجھا ہوا اور عنک وغیرہ دلچسپ ہے۔

"روغن تازہ" جس مضمون کا عنوان ہے، اس کے تحت کس قدر گھٹیا شعر

چکنا چپڑا روغن تازہ کا فن
جو دل سے نہ ہو وہ ہو منہ پہ سخن　　(ص۱۴۵)

درج کیا گیا ہے، جو ناموزوں بھی ہے۔

"سارے گھر والے گھیرے ہوئے تھے، ہنسیاں ہو رہی تھیں" (ص۲۱۹) "ہنسی" کی جمع اردو میں نہیں آتی —— "بوڑ گری والی

گڑیوں کو اپنی زندگی کا منتہی نہ قرار دیں" (صفحہ ۲۲) "منتہی" لانے کی یہاں کیا تک تھی ــــــ "غرض عبد صاحب کی عروضی کہ جو غزل کو مثنوی بنا دے، ہمارے شعراء کے دواوین بیدہ خیالی کے طلسم پریشان ہیں ـــ ان مبسوط مثنویوں کی صورت میں بدل (صفحہ ۱۹۹) یہ صاحب مضمون کی زُشتی کے زمانہ کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ کس قدر ہنسی آنے کی بات ہے کہ آسمان کو گھنگول ڈالے " (صفحہ ۳۱) "گھنگولنا" پانی کے ساتھ بولتے ہیں، مضطر خیر آبادی کی غزل کا مصرعہ ہے ــــ

موتی کی آب دریں دریا گھنگول ڈالے

"آسمان چھان مارا" . . . اس قسم کا کوئی جملہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے لکھنا تھا۔

"ہنسی" اس کتاب کا سب سے اچھا مضمون ہے، عظمت اللہ خاں مرحوم کے مضامین بہرحال دلچسپ ہیں، اُن کا اپنا خاص رنگ ہے

تحریکِ اسلامی کامیابی کی شرائط

از :- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۴۲ صفحات۔
قیمت (سفید کاغذ) ایک روپیہ پچیس پیسے، نیوز پرنٹ، بہتر پیسے۔
ملنے کا پتہ :- ادارۂ مطبوعاتِ طلبہ ۱۴/۱۰۶ء سبیلہ مارکیٹ، کراچی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اللہ تعالیٰ نے دینی فکر، دینی مزاج اور اسلامی سیرت و کردار کے علاوہ اظہارِ خیال کا بھی بہترین سلیقہ عطا فرمایا ہے۔ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں، اُس کا حق ادا کر دیتے ہیں، اس کتاب میں مولانا موصوف نے تفصیل سے بتایا ہے۔ کہ تحریکِ اسلامی کی کامیابی کے لئے کون سی شرائط اور خوبیاں درکار ہیں، انہوں نے اُن خوبیوں کی نشاندہی کی ہے جو تحریکِ اسلامی کے کارکنوں میں پائی جانی چاہئیں ان تمام خوبیوں کا محور " تعلق باللہ" ہے یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا، اُسی قدر تحریک کو قوت نصیب ہوگی۔ اس کے بعد مولانا موصوف نے ان خرابیوں اور کمزوریوں کا جائزہ لیا ہے جن کے پائے جانے سے تحریکِ اسلامی کو نقصان پہونچتا ہے! پوری کتاب دینی جذبات اور اسلامی افکار سے لبریز ہے، اس کے مطالعہ سے اس ناسازگار اور ہنگامہ خیز فضا میں ہمت بندھتی ہے اور اس کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ اقامتِ دین میں تن من دھن لگا کر ہی اللہ تعالیٰ کی رضا میسر آسکتی ہے!

"جنگل کا ایک کانٹا اور راستہ کا ایک روڑا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا، جب تک آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں، پھر بھلا معاشرے میں مدتوں کی رچی بسی خرابیاں محض زبان کے جھاگ اُڑانے سے کیسے رفع ہو جائیں گی۔
گیہوں کا ایک دانہ بھی کسان کی عرق ریزی کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، پھر کیسے اُمید کی جا سکتی ہے کہ معاشرے میں خیرات و حسنات کی کھیتی بس دعاؤں اور تمناؤں سے لہلہانے لگے گی"

اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں دینی افکار اور زبان و ادب کی رعنائی کس مقدار میں موجود ہے!

حریمِ عصمت

از :- آغا صادق، ضخامت ۸۰ صفحات (مجلد) قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ :- مکتبہ آغا صادق، شارع نجم الدین، کوئٹہ

اس کتاب میں جناب آغا صادق کی نظمیں جو ـــــ اخلاق، رومان اور سماج ــــ کے موضوعات پر ہیں، یکجا کی گئی ہیں، یہ نظمیں خاصی لطف انگیز اور دلکش ہیں۔ منتخب اشعار :-

اللہ رے! اوجِ مرتبۂ شانِ فاطمہؓ	قدسی ہیں زیرِ سایۂ داماںِ فاطمہؓ
حسنینؓ ہیں تجلیٔ زہراؓ سے مستنیر	دونوں ہیں نورِ شمعِ شبستانِ فاطمہؓ

سیلِ بلا میں بھی نہ قدم ڈگمگا سکے — قربان ہمت جگر و جانِ فاطمہؓ
دامانِ پاک چادرِ تطہیر کی قسم — حیدرؓ کی جانِ جاں ہے دامانِ فاطمہؓ

بہ حیات) شکلِ انسانی میں تجھ کو لطفِ یزدانی کہوں — مطلعِ ہستی کا یعنی مصرعِ ثانی کہوں
ہے تری تخلیق، تکمیلِ مسرت کے لئے — ہاں! محبت کے لئے بیشک محبت کے لیے
ہم نشینی سے تری دُنیا ہوئی باغِ بہشت — ورنہ دوزخ سے سوا تھا یہ جہانِ سنگ و خشت
("سوا" کی جگہ "بدتر" ہونا چاہئے تھا)

تِ عصمت) ہم آغوشی کو جب اٹھیں بہاریں لالہ زاروں سے
تو نغمے پھوٹ نکلے بربطِ گیتی کے تاروں سے
اسی چشمے سے جوئے زندگی بہتی چلی آئی — اسی اک پھول سے ہر پھول کے لب پر ہنسی آئی

اسی نظم کا ایک شعر ہے ۔
کہا شب نے کہ میں اس کو ستاروں کی ضیا دوں گی — شفق بولی کہ میں رنگین قبا اس پہ لٹا دوں گی (ص ۲۱)
' لٹائی نہیں جاتی ، اُڑھائی جاتی ہے' (۔۔۔ قبا اس کو اڑھا دوں گی)

(دوشیزہ)
کبھی وہ ڈھانکتی تھی دونوں ہاتھوں کو دوپٹہ سے — کبھی گیسو بکھر جانے سے تھی اس کو پریشانی
یہ سنتا تھا کہ دوڑی انکھڑیوں میں شرم کی شوخی — جھکی جھک کر رُکی رُک کر ہوئی محو تحیر انسانی'

ہا کہ جس فتنہ سے پاکستان کا طبقہ اناث دوچار ہے' اُس فتنہ کے خلاف یہ نظم کلمۂ جہاد ہے ۔
. تعاقب کر رہی ہے ہر طرح تہذیب نو میرا — مجھے ڈر ہے جلا ڈالے نہ اس کی شعلہ سامانی (ص ۳۰)
جلاتے ہیں نہ کہ "شعلہ سامانی" !

ّیت) سو جاؤں جب "خوش لحد میں مری پیاری
للہ مری موت پہ آنسو نہ بہانا
لازم نہیں تربت پہ مری پھول چڑھانا
لازم نہیں سرہانے کے لئے سرو لگانا

اور

کافی ہیں مری خاک پہ سبزے کی بہاریں
یا شبنم رخشاں کے گہربار نظارے
تکتے ہوئے آئینے چمکتے ہوئے تارے
وہ گورِ غریباں کے غم انگیز اشارے
(بیاباں کی جگہ "قبریں" یا خاک کے ڈھیر آتے تو ان کے ساتھ "غم انگیز اشارے" نبھ سکتے تھے ۔
(مثنوی عشق و ہوس)

تو جب آئی تھی مرے گھر میں دُلہن کی صورت — تیری بھرپور جوانی تھی چمن کی صورت
چاند کی طرح درخشاں تری پیشانی تھی — تیرے چہرے پہ قیامت کی وہ تابانی تھی
اور اب۔ اُجلے اُجلے رُخِ روشن کے سویرے نہ رہے — تیری زلفوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نہ رہے

اس نظم میں چند اشعار بھرتی کے بھی آگئے ہیں، مثلاً ۔

سرد نظروں کی وہ بیکار نظر آنے لگی — لذتِ زیست گرانبار نظر آنے لگی ہے
وقت سے دہر کا ہر ذرہ زوال آمادہ — وقت سے زیست کا ہر اوج حضیض افتادہ

مجموعی طور پر یہ نظم بڑی اثر انگیز ہے، دورِ شباب گزرنے کے بعد بیوی پر جو کہولت کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے شاعر اپنی سالخوردہ شریک زندگی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ۔

تو یہ سمجھی ہے کہ میں عہدِ وفا توڑ دوں گا — زیست کے موڑ پہ یوں ساتھ ترا چھوڑ دوں گا
حسن ظاہر کا پرستار سمجھ رکھا ہے !
کیا مجھے تو نے ہوس کا بندہ سمجھ رکھا ہے ؟

نیشنل اور الفرڈ
ILFORD
HP3 FILM
ILFORD
HP3
ROLL FILM
ہمہ وقت
آپ کی
مسرتوں
کے ساتھی!
رضوی برادرز لمیٹڈ
کراچی — لاہور — ڈھاکہ
ORIENT